اَندھی لکیریں

آنند لہر

اندھی لکیریں

(افسانے)

آنند لہر

حلقۂ فکر و فن
جموں، توی

قیمت : چالیس روپے -/۴۰
سالِ اشاعت : ۱۹۸۷ء
طباعت : ہندوستان آرٹ پریس، جموں
کتابت : عبدالرشید ڈار، سری نگر

مصنف کا پتہ : پلاٹ نمبر ۱۹، بخشی نگر، جموں توی

ناشر : حلقۂ فکر و فن، جموں توی

تقسیم کار : چنار بک سینٹر
۹۲۲، کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج
نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ترتیب

راستے کا پہاڑ

"دراصل ہم غلط سمجھے تھے" 'س' نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ پہاڑ جسے ہم دیوتا سمجھ کر پوجتے رہے وہی ہمارا سب سے بڑا دشمن نکلا"۔ "وہ پہاڑ جس کو سر کرتے کرتے ہمارے پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور ہم میں سے کتنوں کے جسم برف کی پیاس بجھانے کے کام آئے تھے اور ہم نے سمجھا تھا کہ دیوتا نے بلی قبول کر لی ہے"۔ 'ش' نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

پتے ہواؤں کی زبان ہیں، جب ہوا چلتی ہے تو یہ تڑپتے ہیں کیوں کہ ہوا بول سکتی

[illegible] اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور روشنی کے زخم چاند کے جسم پر نمایاں ہیں" زخمی نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "ساری لڑائی سمجھ کی ہے دوست ورنہ یہ آگ ہی ہے جو ہمیشہ پانی کو جلاتی رہتی ہے۔ یہ خاموشی ہی ہے جو آواز کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے" "لیکن تم زخمی کیسے ہوئے۔ تمہاری شکل تو 'الف' سے ملتی جلتی ہے اور الف تو ہر چیز کی ابتداء ہے"۔

"س" نے سوال کیا۔

"دوست! الف کو الف نہیں رہنے دیا گیا۔ اسے لفظوں کے بیچ اس طرح گرفتا کیا گیا کہ اس کا وجود ہی بگڑ گیا۔ اس کی انفرادیت ختم ہوگئی اور جب کسی چیز کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے تو وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مرجاتی ہے۔ یہی بات ہے کہ کسی شخص نے آج تک الف کو نہیں دیکھا اور تم نے بھی اسی لئے کہا ہے کہ میری شکل الف سے ملتی جلتی ہے"

"لیکن پھر بھی تم زخمی کیسے ہوئے" اس نے پھر اپنے سوال کو دہرایا۔ "بے وجہ جنگ لڑتے لڑتے۔ لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ جنگ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ سامنے محل کے کھنڈروں کی دیواروں پر کبھی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں پاگل شخص نے لکھا ہے 'یہاں پر ایک بار اس لئے سخت جنگ لڑی گئی تھی کہ سامنے پڑی ہوئی انگوٹھی کو کون اپنی انگلی میں پہنے گا' اور اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں"۔

"لیکن تم نے یہ زخم کہاں سے حاصل کیے" "س" نے ایک بار پھر سوال کیا؟ لفظوں کی جنگ لڑتے لڑتے۔ دراصل لفظ ہمارے ساتھ چپک جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اپنی اور لفظوں کی کشمکش میں ہم زخمی ہوجاتے ہیں کیوں کہ بے جان لفظوں پر اس لڑائی کا کوئی اثر نہیں

ہو سکتا۔ دراصل الف سے لے کر "یے" تک ہی تمام لفظوں کا محور ہے۔ سب کا وجود ایک ہی ہے۔ ہم مرتے ہیں لیکن لفظ زندہ رہتے ہیں "

"لیکن ہم لفظوں سے پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے" "س" نے ایک بار پھر سوال کیا!

"سنو! ایک بار ایک شخص نے لفظوں کو پتھروں کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینک دیا تھا مگر بعد میں ہوا یہ کہ پتھر ڈوب گئے لیکن لفظ سمندر کے اوپر پھیل گئے اور دھرتی پر لوگوں نے سنا کہ سمندر گہرا نہیں ہے اُس میں چھلانگیں لگا کر ہیرے موتی حاصل کئے جا سکتے ہیں لوگوں نے سمندر میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب گئے مگر جتنے انسان ڈوبے اتنے ہی لفظ باہر آ گئے"

"لیکن ان سے پیچھا کیسے چھڑایا جا سکتا ہے" اس نے پھر سوال کیا! "ہم لفظوں کو حرفوں میں بانٹ دیں۔ کروڑوں لفظ کٹ کر چند حرفوں میں بٹ جائیں گے اور ہم انہیں آسانی سے ختم کر کے اپنے آپ کو آزاد کر سکیں گے" اتنا کہہ کر وہ زخمی شخص گہری نیند سو گیا۔

"تو تم اس پہاڑ کا ذکر کر رہے تھے "س" نے پھر کہا! سنو! دوست ہم سمجھتے ہے کہ یہ پہاڑ ہماری حفاظت کرتا ہے مگر اس کی پچھلی طرف تو ہمارا کوئی دشمن ہی نہیں ہے بلکہ وہ چشمہ ہے جس کا پانی پی کر مرے ہوئے لوگ زندہ ہو جاتے ہیں اگر یہ پہاڑ بیچ میں نہ ہو تو ہم اسے آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں"

"س" نے جواب دیا ——— !
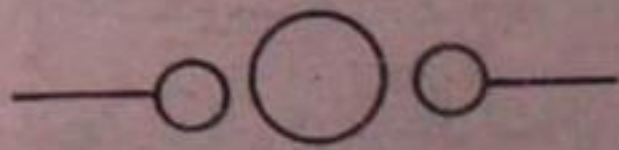
وجود

عجیب : ۔ تو یہ ہے کہ تم جب بھی خاموش ہوتے ہو میں بول پڑتا ہوں
نہ تمہیں اس بات کا علم ہے کہ تم خاموش کیوں ہوتے ہو اور نہ مجھے معلوم ہے کہ میں
کیوں بولتا ہوں۔ مگر تاہم دونوں جانتے ہیں کہ بولنا اس لئے ضروری ہے
تاکہ آواز کا وجود قائم رہے کیوں کہ آواز ہی زندگی کی نشانی ہے اور آواز صرف
آواز ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ یہ وجود کو پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ وجود اس
سے پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، پھیلتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا اپنا

کوئی وجود نہیں۔

میرے کان، آنکھیں، ہاتھ ہر وقت بولتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف بولنا ہے۔ کوئی سُنے یا نہ سُنے اس بات سے انھیں کوئی غرض نہیں اور پھر یہ بات بھی تو بالکل غلط ہے کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں کیونکہ ان میں لگائے جانے والے پتھر تو پہلے ہی بہرے کر دیے جاتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے لوٹنے کی آواز نہ سن سکیں۔

اور وہ میرے جاگنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ میں نے یہ بات تم سے سُنی ہے۔ حالانکہ دروازے نے صرف اتنا کہا کہ اُس نے اُسے بند کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی میرے ہاتھوں میں تھیں مگر وہ گیا کہاں اس بات کا کسی کو علم نہیں اور وہ مجھ سے کب الگ ہوا یہ بھی میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے الگ ہوا ہے اور میرا ہی ایک حصّہ ہے اور میں اُس کے الگ ہونے کے بعد بھی میں ہی رہا ہوں۔

میں اُسے بچھڑتے ہوئے اس لیے نہیں دیکھ سکا کیوں کہ اُس وقت میری آنکھیں غسل خانہ کی دیوار میں بنائے گئے سوراخ کے ذریعہ سولہ سال کی کنواری لڑکی کو نہاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور یہ سوراخ میں نے ہی رات کے اندھیرے میں کر کے شہر کے راجہ سے یہ اعلان بھی کرایا تھا کہ ایسا اس لیے ضروری ہے کیوں کہ کنوارے جسموں کو دیواروں سے بھی بچ کر رہنا چاہیے اور راجہ نے اس ڈر سے یہ اعلان کیا کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ میں

یہ راز جانتا ہوں کہ اس کے سر پر جو تاج ہے وہ سونے کا نہیں ہے۔

مگر میرے پینے پر بھی اس لیے ضروری تھا کیوں کہ سمندروں کے شہر میں ریت کے گھروں والی بستی میں وہ بیوپاری آئے ہوئے ہیں۔ جو دن اور رات بیچتے ہیں مگر عمر خرید لیتے ہیں اور یہ سودا سب کو اس لیے کرنا پڑے گا کیوں کہ یہ موسموں کا حکم ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ عمر کا سودا کرنے سے پہلے کیوں نہ خوبصورت بدن دیکھ ہی لوں کیوں کہ اس سے میری آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور میں آسانی سے سورجوں کے شہر سے گزر جاؤں گا۔

مگر سوچ پھر بھی اس راز کو نہ پا سکی۔ آخر اس دوڑ کا فائدہ کیا ہے پاؤں تھک چکے ہیں۔ آواز نے بھی اب ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے مگر اس سوال کا جواب مل جانے کے بعد تم یہ بھی پوچھو گے کہ ہم موسموں کے غلام کیوں ہیں اور ہمارے جسم ہمارے ہوتے ہوئے بھی ہمارے کیوں نہیں ہیں لو میں تمہیں اپنی کوشش کے باوجود یہ جواب نہ دے سکوں گا کہ آسمان کا بھی کوئی وجود نہیں لہٰذا اس بات پر کبھی یقین نہ کرنا کہ جب اوپر سے پتھر برسیں گے تو یہ ہمیں بچائے گا۔ کیوں کہ خوبصورت کنواری لڑکیوں کے دوڑنے سے جو دھول اٹھتی ہے برہم چاری اسے ماتھے پر لگا کر تیاگ کا پرچار کرتے ہیں اور آسمان کا نام لے کر ڈراتے ہیں۔

گویا کہ تمام ناموں، رشتوں، ناطوں کا حاصل صرف تین لفظ ہیں۔ میں، تم اور وہ۔ تم ہمیں سے نکلتا ہے اور وہ تم سے۔ اور وہ کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا جنم بھی میں ہی سے ہوا ہے۔ یہی بات ہے کہ جنگ جاری ہے

اور جن کاغذوں کو فلسفے سمجھ کر سنبھال کر رکھا گیا تھا اُن کی بچوں نے کاغذ کی کشتیاں بنائی ہیں۔

اور پھر میں جب واپس آ کر اُس سے ملا تو اُس وقت موسم بوڑھے ہو چکے تھے اور درختوں کے پھل جانور کھا چکے تھے اور پھر ایک تیسرے راستے سے تم بھی آ گئے۔ وہ تینوں آپس میں ملنے ہی لگے تھے کہ زور کی آواز جو نہ کسی نے کہی اور نہ کسی نے سنی مگر جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر چیز کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُسے ختم ہو جانا ہے مگر پھر بھی اپنے وجود کو قایم رکھنا ہے۔

سفر

کچھ لوگوں کے کٹے ہوئے ہاتھ، پاؤں، ناک، آنکھیں دیکھ کر اس نے پوچھا "کہ آخر اتنا سفر تم نے طے کیسے کر لیا۔ اور یہ کٹے ہوئے جسمانی اجزا کن لوگوں کے ہیں؟" یہ آواز کسی ذہن نے سوچی نہ تھی اور کسی زبان سے نکلی نہ تھی بلکہ اس کا اپنا ایک وجود تھا۔ اسے محسوس وہ سفر کے شروع ہی سے کر رہا تھا لیکن سنائی یہ اب دی تھی۔

"یہ لوگ جن کے پاؤں یہاں پہنچے ہیں، سڑک کے کناروں پر اپنے

پاؤں تلاش کر رہے ہیں۔ انھوں نے میلوں زمین اس تلاش میں کھود دی ہے کہ شاید پاؤں زمین کے اندر چلے گئے ہوں گے اور اس تلاش میں کئی لوگوں کے ہاتھ بھی ان سے الگ ہو گئے ہیں۔ دراصل اتنے لمبے سفر میں ان کے پاؤں ان سے آگے چل دیئے۔ کیوں کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے پاؤں کاٹنے کی سوچتے رہتے تھے اس لیے جب ان کے اپنے پاؤں الگ ہوئے تو محسوس نہ کر سکے۔

یہ ان لوگوں کے کان ہیں جنھوں نے انکار کر دیا تھا۔ حالاں کہ قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں، پرندوں، درختوں کی آواز کو موسموں میں نچوڑ کر ایک لفظ تیار کیا تھا، جسے بعد میں شبنم میں دھو کر ان کو سننے کے لئے کہا تھا۔

یہ ان لوگوں کی زبانیں ہیں جنھوں نے بولنا بند کر دیا تھا حالاں کہ بے گناہوں کو سزائیں دینے سے پہلے ان سے پوچھا گیا تھا "کیا قتل تمہارے سامنے ہوا ہے"۔ لیکن ان کے دلوں میں چھپی ہوئی تخریب نے انھیں زبان کھولنے سے روک دیا تھا۔

یہ ان لوگوں کی آنکھیں ہیں جنھوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا حالاں کہ قدرت نے کائنات کے تمام سورجوں کی روشنی کو جمع کر کے لمبے کروڑوں سالوں کی راتوں کی سیاہی میں نچوڑ کر اس نور کی ایک کرن کو شفق میں ڈبو کر انھیں دیکھنے کے لئے کہا تھا۔

یہ ہاتھ ان لوگوں کے لیے ہیں جنھوں نے چاند کے چہرے کو نوچنا چاہا تھا مگر وہ بھول گئے تھے کہ چاند کا وجود پتھروں اور پہاڑوں کا وجود ہے اس لیے ان کے ہاتھ زخمی ہو کر گر گئے اور ان سے الگ ہو گئے۔

یہ لوگ راستے میں ایک دوسرے پر چوری کا الزام لگا کر رہے ہیں۔ "تم نے میرے کان چھین لیے۔ تم نے میرے پاؤں کہیں گم کر دیے" اور اب ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ سڑک کے اس طرف ہیں جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں کچھ نہیں نظر آتا۔ اسی لیے وہاں پر تمام رشتے ناطے، تعلق واسطے ختم ہو گئے ہیں اور ایک نہ ختم ہونے والی ایسی جنگ جاری ہے اور سڑک کے اس طرف اتنی روشنی ہے کہ وہاں پر کوئی کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس لئے وہاں پر بھی انسان اور حیوان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے پر پتھر مارتے ہیں۔ یہ پتھر سڑک کے بیچ میں پڑتے ہیں۔ اس لئے وہاں پر کوئی کھڑا ہو نہیں سکتا۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے اور روشنی کے رتھ کو کٹے ہوئے ہاتھ اس پار کا راستہ بتاتے ہیں۔"

"لیکن پھر بھی تم یہاں کیسے پہنچ گئے" "جب میں نے سفر شروع کیا تھا تو راستے میں کانٹے ہی کانٹے تھے۔ نوکیلے پتھروں اور گہری کھائیوں سے بھرا ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ آگے چل کر صاف راستہ ضرور آئے گا۔ میرے عزم سے امید کی کرن پھوٹی۔ میں اسی امید کے سہارے صدیوں چلتا رہا۔ لیکن جب وہ صاف راستہ جس کے دونوں طرف پھول تھے اور جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا، میرے سامنے آیا تو میں گھبرا گیا کیوں کہ اس وقت تک مجھے نوکیلے پتھروں پر چلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اب ملائم راستے مجھ سے چلا نہ جاتا تھا۔ میرے پاؤں پھسل جاتے تھے لیکن مجھے اس

تھی کہ اس کے بعد پھر وہ نوکیلے پتھروں والا راستہ ضرور آئے گا۔ میں اسی امید کے سہارے چلتا رہا لیکن جب نوکیلے پتھروں اور گہری کھائیوں والا راستہ سامنے آیا، اس وقت تک صاف راستے پر چلنے کی عادت ہو چکی تھی۔ پھر میں اسی امید کے سہارے نوکیلے پتھروں پر چلا کہ اس کے بعد صاف راستہ ضرور آئے گا۔ بس اسی طرح میں چلتا رہا اور سفر کٹتا رہا۔

سفر کے لئے یہ شرط بھی ضرور تھی کہ تم رک سکتے ہو لیکن واپس نہیں جا سکتے۔ اس سفر میں کئی رشتے ٹوٹے اور بنے۔ کئی لوگ آپس میں ملے اور مل کر بچھڑے۔ بیوی ایک جگہ تھک کر بیہوش ہو گئی۔ شوہر اس سے آگے اُس کے انتظار میں رکا رہا۔ بیوی اس انتظار میں رہی کہ شوہر پیچھے آکر اسے ساتھ لے چلے اور شوہر کی یہ مجبوری رہی کہ وہ پیچھے جا نہیں سکتا تھا۔ اس طرح یہ رشتے ٹوٹے اور اسی طرح یہ رشتے بنے۔ ایک کا شوہر آگے نکل گیا اور دوسرے کی بیوی۔ انھوں نے آپس میں رشتہ قائم کر لیا۔ ایک کا بیٹا کھو گیا، دوسرے کی ماں۔ ایک کا بھائی کھو گیا، دوسرے کی بہن۔ اس طرح یہ رشتے ٹوٹے اور بنتے رہے۔"

ایک سلسلہ ہے۔ ایک سفر ہے چلتے رہو۔ یہ سوچے بغیر کہ کہاں پہنچو گے۔

••

جواب

تم ہر بار جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے سوال بھول جاتے ہو۔
یہی بات ہے جب جواب ملتا ہے تو تم اِسے پہچان نہیں پاتے۔ سوال اور
جواب میں ایک عجیب سا تعلق ہے اور یہ تعلق کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔
اِسی تعلق سے کائنات کا یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اگر تعلق ختم ہو جائے اور
سوال بھی ختم ہو جائیں اور جواب بھی مر جائیں۔

سوال یاد رکھنا ضروری ہے ورنہ جواب کو پہچان نہ سکو گے۔

ایک صدی ایک لمحے کا انتظار کرتی رہی لیکن لمحہ صدی میں کھویا رہا۔ صدی لمحہ کے لئے پریشان رہی اور لمحہ اس جدوجہد میں کہ کس طرح آزاد ہو۔ یہ ایک عجیب سی جنگ ہے۔ ہر چیز الگ ہو کر اپنا وجود بناتی ہے لیکن اس کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے۔ جدوجہد کرنی پڑتی ہے نرگس بہار سے الگ ہو کر اپنا وجود ضرور رکھتی ہے لیکن بہار کی دلکشی سے محروم ہے۔ ہر چیز اپنا جواب چاہتی ہے۔ وجود کا جواب سایہ ہے اور سائے کا؟ سایہ ایک سوال ہے۔ اس کے قصے ہیں کہانیاں ہیں۔ لیکن جواب نہیں۔

وہ کشتی بالکل اکیلی سمندر میں جا رہی ہے۔ سمندر شانت اور خاموش پھیلا ہوا ہے لیکن مانجھی پیاسا ہے۔ سنا ہے ایک بار ایک مانجھی سمندر میں پیاس کی وجہ سے مر گیا۔ سمندر بارش دے سکتا ہے جس سے دریا بنتے ہیں لیکن سیپ کو پانی کا ایک قطرہ نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے آسمان کی مہربانی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بیچارہ سمندر۔

سیپ کا سوال قطرہ ہے اگر جواب میں اسے سمندر ملے تو کیا فائدہ نہیں ہے اگر ہوا چند منٹوں کے لئے زمین کو چھوڑ دے تو انسان حیوان درخت سبھی مر جائیں، لیکن کبھی کبھی انسان آندھی میں گھٹ کر مر جاتا ہے۔

ہر آنکھ کی اپنی خاص پسند ہوتی ہے۔ زیادہ خوبصورت چیز دل کی ایک خاص جگہ ہے۔ گلاب باغ میں ہی اُگتا ہے۔ باغ کی مٹی گلاب کو

اُگانا جانتی ہے۔ صحرا کی ریت کیا جانے، وہ اپنے اندر کسی کا وجود نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اِس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ اگر تم دوسروں کو اپنے اندر سمونا چاہتے ہو تو پہلے اپنا وجود بناؤ۔ مہینے برسوں سے بچھڑ کر اپنا ایک الگ وجود بنا لیتے ہیں اور دِن مہینوں سے بچھڑ کر دس سال کے بعد ایک لمحہ کے لئے۔ اِسے دیکھا تو چیخ کر کہا "پکڑو۔ پکڑو۔ لیکن دس سال اِسے پکڑ نہ سکے۔ وہ لمحہ اب عُمر کے سالوں سے الگ ہو کر اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ ایک تاریخ ہے ایک تاریخ ہے اِس کی یاد وہ کیسی خوبصورت ہے۔ اِس کی شادی ہو گئی ہے اِس کا چہرہ کیسا ہے مُرجھایا تو نہیں"۔ یہ سب سوچیں اِس ایک لمحہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ چھوٹا بڑا ہونا بھی کیا عجیب لگتا ہے۔ کوا پیاسا ہے۔ پانی گھڑے کی تہہ میں ہے اِسے چھوٹے کنکر چاہیئں پہاڑ نہیں۔

یہ لوگ سمندر کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ زمین پر پانی کا قحط ہے اور سمندر کے کنارے رہنے والے لوگ زمین کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ کیونکہ سمندر اُنہیں اپنا پانی پینے نہیں دیتا۔

چاند کے سینے پر داغ ہے لیکن چاندنی تو بے داغ ہے اُس عورت کی سفید ساڑھی پر کالا دھبہ ہے اور یہی دھبہ ظاہر کرتا ہے کہ ساڑھی سفید ہے۔ بدصورت چیزیں خوبصورت چیزوں کی ضمانتیں ہیں۔

یہ دیکھو جوابوں کی فہرست ہے۔ خوبصورتی۔ بدصورتی۔

چاندنی ۔ سمندر ۔ پیاس ۔ لیکن سوال کہاں ہے ۔ اب تم سوال
بھول گئے ۔ چلو اب سوال ڈھونڈتے ہیں ۔ لیکن اِتنا یاد رکھنا ۔
اب کی بار سوال کا جواب ڈھونڈنا نہیں بلکہ اِسے حل کرنا ۔ اگر جواب
غلط بھی نِکلے گا ۔ لیکن سوال تو یاد رہے گا ۔ •••

پانی کی لکیریں

اور پھر مٹی کا یہ کھیل تب تک جاری رہے گا جب تک کہ آسمان
کے نیلے رنگ کو خدا بنائے نہیں بنتی۔ کھلونے ٹوٹتے اور بنتے رہیں گے
ریت کے گھروں میں رہنے والے لڑکے پانی کی لڑکیوں کو تب تک چھیڑتے
رہیں گے جب تک ستاروں اور سیاروں کی یہ جنگ جاری رہے گی۔ اس لئے
مسافروں سے کہو کہ بولنا بند کر دیں کیونکہ اس سے ہوا کے سینے میں بلا وجہ
زخم پیدا ہوتے ہیں۔ اور مٹی کے جسم پہاڑوں سے ٹکرانے کی کوشش

کرتے ہیں۔

آخر کھلونے بنانا اور توڑنا بھی سو سال کے بوڑھے بچے نے اسوقت سیکھا تھا جب اسکی جوان ماں اسکے بوڑھے باپ سے روٹھ کر مان جایا کرتی تھی۔ اور ان کا جھگڑا اس بات سے تھا کہ بچپن کے کھیل کو کون چرا لے گیا۔ اور سامنے والی دیوار پر یہ کس نے لکھا کہ تمام رشتوں کی حقیقت صرف لفظ ہیں جو اپنا مطلب بدلتے رہتے ہیں اور پھر دادی اماں اپنے پرانے دلوں کو یاد کرنے کے لئے اپنے نوجوان پوتے کو یہ صلاح دیا کرتی ہے "لڑکیوں کے پیچھے نہ گھوما کر،" حالانکہ ان لفظوں کے پیچھے وہ کنکر ہے جو ان کے لڑکپن کی یاد ہے۔ جب وہ ایک بار چشمے سے پانی پی رہی تھی تو ریت کے خریدار نے اسکے سر پر مارا تھا۔ باہر سے اس نے سخت غصہ کیا تھا مگر دل کے اندر ریت کا شیش محل تیار کیا تھا جسکی طاقت اسے اس وقت پہاڑ سے بھی زیادہ محسوس ہوئی تھی لیکن اس بات کا علم اسے اس وقت ہوا جب چاندنی رات میں کسی نے گلاب کے پھول کو توڑا تھا کہ ریت کے گھروں کا مقدر بکھرنا ہے اور پتھر کے گھروں کو ٹوٹنا ہے۔ اس لئے جہاں بھی ہو سامان باندھ کر تیار رہو۔ بوڑھے پتے جوان درختوں کے جسم پر زخم ہیں۔ اور ان کی وہ کہانیاں ہیں جو وہ دوسروں کو سناتے رہتے ہیں جب ہم زخموں کی مرہم تو نہ بنے مگر داغدار ہو گئے اور شبنم ہٹنی کے داغوں کو کبھی دھو نہ سکے گی۔ کیونکہ اس کے دل میں تو خود روشنی کے زخم ہیں لیکن

سلسلہ پھر بھی جاری رہنا چاہیئے۔ دریا سونے سے پہلے سمندروں کو
جگا گئے اور یہ راز آخر کار ظاہر ہو ہی گیا کہ گلی کی بھیڑ پہاڑوں کے
سب راز جانتی ہے اور یہ بھی سب کو پتہ ہے کہ دیواروں کے کان سُننے
کے لئے نہیں بلکہ لفظوں کو جذب کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی گھر
کے دروازے دیواروں سے پوچھتے ہیں کہ دادا کو اپنی سولہ سالہ پوتی پر
پیار کیوں آتا ہے اور وہ کیوں چاہتا ہے کہ وہ بالوں میں دوپہ باندھے
ڈالے۔ فرش پر پڑی ہوئی لکیروں نے ہمیشہ کہا ہے کہ سب ایک ہی
کہانی کے کردار ہیں ایک ہی طرح کے لفظ ہیں۔ جنکی صرف ترتیب بدلتی
ہے، صرف ایک سلسلہ ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بہن اور بھائی کے
پیار پر بھی کانٹوں سے اُلجھے ہوئے پھولوں نے شک کیا تھا لیکن پھر
بھی نہ جانے کیوں رشتوں کے بیوپاری شہر شہر گھوم رہے ہیں اور گلی
کے سانپوں کو پوجتے ہیں جب کہ گھروں کے ناگوں کو اس لئے مارتے ہیں
کیونکہ ماں باپ کو بچوں سے اور بچوں کو ماں باپ سے پیار ہے ورنہ انھیں
پاپ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔
●●

دائرہ

پتھروں کی نوکیلی فصل مٹی کے ہتھیار اور پھر کھیت میں ریت
کے وہ پرانے پتھر بھی بکھرے ہوئے ہیں جو ان قبروں کے سرہانے رکھے گئے
ہیں جن میں دفن ہونے والی لاشوں کے متعلق یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان
کی ہڈیوں میں ایک ایسا امرت گھلا ہوا ہے جو ان سادھوؤں کی مکتی کی وجہ
بن سکتا ہے جو زہریلے ناگوں کی طرح ستاروں کے درخت پر چڑھی
ہوئی۔ دھرتی کی کوکھ سے بھاگی ہوئی دشمن کے جگنوؤں کی بیلوں کو اپنی

سانسوں سے ڈس کر دھرتی کے میلوں اندر آسماں کے جسم میں ایک ایسا سوراخ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے وہ کا پنج کے برتن دکھائی دیں، جن کے اندر ایک ایسی دھات بھی ہے جو سورج کی روشنی کے سات رنگوں کو شیشے کے برتنوں میں گرفتار کر کے ریت کی گھڑوں میں پانی لالا کر ان زمینوں کو سیراب کرنا چاہتی ہے جہاں کبھی رنگوں کی وہ فصل پیدا ہوئی تھی جسے اندھیرے کے آنگن میں دیکھ کر سمندر کے وہ بچے آپس میں لڑ پڑے تھے جنھیں اگلی جنگ میں سورج کے رتھ کے گھوڑے چرانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

اور پھر سونے کی چوڑیوں پر پیتل کا رنگ چڑھا کر چاندی کا بیوپار کرنے والے سناروں نے ہی تو پہاڑوں پر لکڑی کا کام کرنے والے لوہاروں سے یہ کھدوائی کروائی ہے کہ

دائرہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں آ کر ختم ہو جاتا ہے اس لئے زندگی کے آغاز اور انجام کے متعلق لڑائی فضول ہے اور لفظوں سے کھو کر کتابوں کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حقیقت کو پہچانیں۔

••

زندگی کے زخم

دھوپ اور چھاؤں کی جنگ میں درختوں کے پتّے زخمی ہو گئے ہیں اور ہواؤں کے زخم اُن کے چہروں پہ نمودار ہونے لگے ہیں۔ زخمی پتّوں نے چاروں طرف درد کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص بغیر کسی وجہ کے چیخ رہا ہے، انھیں صرف چیخنا ہے۔ دراصل سفر کے شروع میں وہ سب بڑے مزے میں تھے۔ سڑک کے دونوں طرف جو اُگتا تھا اُسے کھا کر چلتے

تھے۔ انھیں صرف چلنا ہی تھا۔ ان میں سے کسی نے نہ سوچا تھا کہ انھیں کہاں جانا ہے۔ ایک دن یہ طویل قطار پانی پینے کے لئے رُکی، اُن میں سے کچھ کے سامنے دریا آیا، اور کچھ کے سامنے سمندر، کئی لوگوں کے سامنے ایک طرح کی خوراک آئی اور کئی لوگوں کے سامنے دوسری طرح کی۔ انھوں نے چیزوں کو بدلنا شروع کر دیا اور بیوپاری ہو گئے۔ چیزوں کے لین دین میں اُن کے ہاتھ پانو، ناک، اور چہرے بھی بدل گئے۔ اُن میں سے کسی کا جسم اُس کا جسم نہیں رہا بلکہ مختلف جسموں کا مجموعہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آنکھیں ایک طرف دیکھتی ہیں تو پانو دوسری طرف چلتے ہیں۔ وہ سب ٹھوکروں سے زخمی ہو گئے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک زخمی ہے لہولہان ہے۔ جگہ تھوڑی ہے اور آدمی زیادہ۔ کیونکہ لین دین میں اُلجھے ہوئے یہ لوگ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں گو آگے میلوں زمین خالی پڑی ہے ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش بن گئی کہ وہ سورج کو پکڑ کر اپنی جیب میں ڈال لے اور ساری زمین پر اندھیرا کر کے پھر اپنی مرضی سے روشنی بانٹے ـــــ روشنی کی اس خواہش کو اپنے دل میں رکھنے کی وجہ سے اُن سب کے چہرے کالے ہو گئے ہیں اور آنکھوں میں سورج کو دیکھنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی ہے اور زخمی پتے ایک ہی بات کو بار بار دہرا رہے ہیں

"سورج تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گا اور یہ مت سوچو کہ چاند کو تم آسمان سے زمین پر اتار سکو گے اور یاد رکھو تم نے اگر اُسے اپنے بچوں کا کھلونا بنانے کی کوشش کی تو اُن کے ہاتھ جسم سے الگ ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ سورج اور چاند کو پکڑنے کے بجائے اپنے گھروں کی دیواروں پر ننگی تصویریں بنا کر ان کے کپڑے بننے میں مصروف رہو۔"

اندھی روشنی

تمہارے اس رقص سے ریت اُڑ کر معصوم بچوں کے پھیپھڑوں میں
وہ بیماری پیدا کرتی ہے جس کا علاج ڈھونڈنے والوں کو اپنے ہاتھ چاندی کے
ہتھیاروں سے کاٹ کر پہاڑوں سے گمنام چٹے بہا کر لانے والے رنگ دار پانی
کے بے رنگ دریا میں پھینکنے پڑتے ہیں اور لہو کی بوندیں آنسوؤں کی پہاڑیوں
سے ٹکرا کر وہ اندھی روشنی برساتی ہیں کہ درختوں پر رہنے والے پرندے اپنی
معصوم روحوں سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اتنے بڑے وسیع میدان کو کیا کسی نے

ایک نظر سے بنایا ہے۔ خوبصورت بدن ہنستے ہوئے چہرے، کھلتے ہوئے درخت
کیا صرف کسی کا تجربہ ہیں؟ ایک کھیل کے سوا ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

چراغ جلانے والے کے ہاتھ ایسے جلے کہ دھوئیں میں آسمان گم ہو گیا اور کاغذ پر پھیلی ہوئی لکیریں شاید کسی نئے مذہب کے متبرک الفاظ ہوں۔ اندھے پجاریوں نے مندر میں اس قدر روشنی کی تھی کہ یاتری ننگے پاؤں بھاگ گئے۔

پکی ہوئی فصل پر اُن ہی لوگوں کا حق نکلا جنہوں نے دھرتی کے آنگنوں کے اندر سوراخ کر کے لوہے کے وہ کیل ٹھونسے تھے جو چاندنی کے جسم کو لہولہان کر کے تاروں کے اُس گروہ سے پناہ مانگنے آئے تھے جس نے آسمان کے خلاف اُس کے بدن سے نیلا رنگ چرانے کی سازش کر کے دیوتاؤں کے شہر میں پانیوں کے پہاڑوں کو جلا کر اُس راز کو فاش کرنے کی کوشش کی تھی، جسے جاننے کے لئے دھرتی کے پیشواؤں نے اپنے ہاتھ کٹوا کر اپاہج بن کر پتھر کے دیوتاؤں کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی گھاس اور پتوں کی کتابوں سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ وہ ورق کہاں ہیں، جن پر لکھا ہوا ہے کہ "انسان خدا کا بیٹا ہے"۔

اُلجھن

اِس شخص نے لفظوں کا انجام دیکھ لیا ہے مگر اِس کے باوجود وہ رشتوں ناطوں کے لئے لڑنے کے لئے تیار ہے حالانکہ سچ یہ ہے۔ رشتے ناطے، پیار، محبّت صرف لفظ ہیں جو وقت پاکر صرف کاغذ پر ایک دھبہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اِس کا سایہ صدیوں سے چیخ رہا ہے۔ "زمین ٹھنڈی ہو کر ایک دن سکڑ جائے گی۔" مگر وہ گھر کو پھیلانے میں مصروف ہے وہ اپنے گھر کو اتنا پھیلانا چاہتا ہے کہ تمام زمین اس کے اندر سما جائے۔ اب اِس

نے دروازے کے سوراخوں کو اپنی خوبصورت بیوی کے دوپٹے سے بند کرنا شروع کر دیا۔ ظاہراً وہ کہتا ہے کہ وہ ایسا اس لئے کر رہا ہے کہ ٹھنڈی ہوا اندر نہ آسکے۔ مگر اصل میں اسے آج تک اپنے لڑکپن کی عادتیں یاد ہیں۔

اور پھر ایک دن اس شخص کو معلوم ہو گیا کہ آگ چیزوں کو جلا سکتی ہے مگر گرمی نہیں پیدا کر سکتی۔ مگر اس وقت تک وہ اپنا گھر جلا کر بے گھر ہو چکا تھا۔ اس کو معلوم ہو گیا ہے کہ گرمی برف کی ٹھنڈک سے پیدا ہوتی ہے مگر اس کے ہاتھوں نے اب برف کو چھونے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ تمام عمر وہ اپنے ہاتھوں کو برف سے ڈراتا رہا۔ لہٰذا اب اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچے کو یہ کہہ کر سلا دیا جائے کہ اگر وہ اس کی ضد پوری کرنے کیلئے چاند سے روشنی چرانے کے لئے آسمان پر جائیگا تو چرخہ کاتنے والی بوڑھی اسے ستارہ بنا کر آسمان پر ہی لٹکا دیگی کیونکہ اس کا بچہ چاہتا ہے کہ وہ چاند کی روشنی سے اپنے ریت کے گھر کو روشن کرے۔ دراصل ہر شخص کی خواہش یہ ہے کہ وہ چاند کی روشنی چھینے۔ مگر لوگ بے لبسی کی وجہ سے خاموش ہیں اور دیئے بنانے میں مصروف ہیں۔ وہ بارہا کہہ چکے ہیں کہ آسمان سے جنگ کا اعلان کیا جا چکا ہے اور اب دیئوں کی روشنی سے چاند کو کالا کیا جائے گا اور پھر دھرتی پر لا کر اسے اندھیروں کے شہر میں گرفتار کیا جائے گا۔ اگر بچہ پھر بھی پوچھے ایسا کیوں ہوگا تو اسے یہ کہنا پڑے گا کہ اس کا جواب دینے کے بعد گھر کے

مرغے بولنا بند کر دیں گے اور بکرے اپنے قتل کے خلاف احتجاج کریں گے۔ اگر بچہ پھر بھی نہ سوئے تو اسے بھوت پریت کی کہانی سنا دو جب ڈرے گا تو پھر ضرور سو جائے گا۔

ہم میں سے ہر شخص کے اندر ہر وقت ایک بچہ، ایک بوڑھا اور ایک نوجوان رہتا ہے اور عمر نام کی کوئی چیز نہیں۔ بس یا بچہ ہے یا جوان ہے یا بوڑھا ہے۔

وہ ہمیشہ اُلجھا رہتا ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں صرف بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک ہی وقت ماضی، حال اور مستقبل بھی ہے یہی بات ہے کہ اس کا بچہ تو سو گیا مگر اس کا نوجوان سوال کرتا ہے اور بوڑھے کو جواب دینے پڑتے ہیں اور بچہ جب جاگا تو چیخنے لگا، رونے لگا۔ کہنے لگا مجھے چاند چاہیے نوجوان نے کہا کہ کاش غار اور لمبی ہو جاتی، بوڑھے نے کہا کاش میں غار سے باہر آ سکتا۔

سولھواں برس

" دراصل ہولانے شروع ہی میں ہم سے غلطی کرائی"، بوڑھے بچّے نے یہ لفظ کہے اور راستے پر چل پڑا۔

" تو بہتر یہی ہو گا کہ جہاں راستہ مڑے تم بھی موڑ کاٹتے جاؤ کیونکہ بالوں راستے کے موڑوں کے ساتھ ہی مڑتے ہیں۔" دوسرے آدمی کا جواب سن کر پہلے نے مسافروں کو گننا شروع کر دیا " ایک، دو، تین چار، پانچ " " کیوں گن رہے ہو " " یہ جاننے کے لئے کہ ہم کتنے تھے اور

کتنے رہ گئے ہیں۔"

صدیوں گننے کے بعد بھی وہ شخص یہ نہ جان سکا کہ وہ کتنے تھے اور کتنے رہ گئے ہیں۔ کیونکہ ہر آدمی نے اسے نمبر غلط بتایا۔ وہ چیخا اور کہنے لگا "تم نے میری عمر ہی ضائع کر دی ہے اور ساتھ ہی سولھواں سال بھی۔"

ہر شخص کو یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنا سولھواں سال سنبھال کر رکھے ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ یہ برس انھیں باقی عمر سے الگ کر کے دیا جائے۔ مگر ان کی یہ بات سنی ہی نہ گئی کیونکہ سفر کی تیاری کا شور بہت زیادہ تھا۔ دستور کے مطابق ان میں سے ہر آدمی کو سولھواں برس ضرور ملنا تھا کیونکہ اس ایک برس کی خاطر انہوں نے باقی برس قبول کئے تھے اور اتنا بڑا بوجھ قبول کرنے کے لئے وہ مان گئے تھے مگر ان سے دھوکا یہ ہوا کہ یہ برس بھی انہیں گنتی کا دیا گیا اور اس کے آگے اور پیچھے سترہ اور پندرہ رکھ دیئے گئے۔ وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے ہی لگے تھے کہ ہوا نے کہا "جلدی کرو سورج نے سفر شروع کر دیا ہے۔"

حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ سورج شروع ہی سے سفر میں تھا اور وہ وہاں پہنچا تھا۔ اس کے دوبارہ سفر شروع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"مگر یہاں پر ہر آدمی اپنا نمبر غلط کیوں بتاتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔

ہواؤں کے شہر میں یہ خبر پھیلا کر کہ آگ اور پانی آپس میں،

بھائی بہن ہیں۔ وہ شخص اتنے زور سے بھاگا کہ اپنی آواز کو سنا لوٹوں کے شہر ہی میں بھول گیا اور لہجہ میں بھیگی ہوئی سطروں کو اپنا کر خوش ہو گیا مگر یہ سطریں اس کی ماں کی جوانی کے بارے میں نہیں، وہ اس بات پر خوش ہوا کہ اسے سطریں مل گئی ہیں مگر اسے یہ دکھ بھی ہے کہ اس کی ماں کو پتہ لگ گیا ہے کہ اس کے بیٹے کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی ماں جس وقت اس شخص کے ساتھ سوئی تھی وہ اس وقت اس کے بچے کا باپ نہیں تھا۔

"تم ایک بار پھر سوال کرو"، دوسرے نے جواب دیا۔ "مگر مجھے تو اب کی بار سوال ہی یاد نہیں رہا۔"

لوگوں کو خوبصورت لفظ تو دیئے گئے مگر ساتھ ہی ہوا کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ ان کے مطلب نکال کر ان کی زبان کو دے دے۔

اب تو یوں ہو چکا ہے کہ آنکھیں دیکھ کر جو محسوس کرتی ہیں۔ وہ زبان کہہ نہیں سکتی۔ اور آنکھوں کی کہانی بیان کرنے کے لئے ہاتھوں نے دیواروں پر تصویریں بنانا شروع کر دی ہیں۔ اب ہر شخص کپڑے پہنے ہوئے ہے مگر اس کے باوجود ہر آدمی ننگا ہے اور ہاتھوں سے ذہن کا تعلق اس وقت ٹوٹا جب انہوں نے ستاروں کو نوچ کر جیب میں ڈالنے کی خواہش کی تھی۔

پھول کھلے ہوئے تھے کہ مسافروں کی آرزوئیں پوری ہو گئیں اور بنجارے کے پاس جتنے بھی رنگ تھے وہ ہوا نے چوس لئے اس نے

آواز دی "رنگ خریدو، بہت دور سے رنگ لایا ہوں"، مگر لوگوں
کو معلوم تھا کہ اس کے رنگ ہوا نے چوس لئے ہیں اس لئے انہوں نے
اس کی پرواہ نہ کی مگر بنجارے کو اس چیز کا علم نہ تھا وہ آواز کے
سہارے چلتا رہا۔ آخر اس کی آواز نے بھی اُسے دھوکہ دیا۔ کیونکہ لوگوں
نے اُسے بھی سُننا چھوڑ دیا تھا اور ایک دن اس نے سُنا کہ سورج کی
روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے وہ ننگا ہوکر دھوپ میں کھڑا ہوگیا
جوان لڑکیوں کے سامنے بوڑھوں نے اس پر پتھر برسائے اور پھر سورج
کے سامنے یہ تیسرا قتل بھی ہوگیا۔

پہلا قتل سورج کے سامنے اس وقت ہوا تھا جب چاند سے
اس کی روشنی چھینی گئی تھی اور دوسرا قتل اس وقت ہوا تھا جب
دھرتی سے اس کی رفتار چھین لی گئی اور زمین تو سفر کروڑوں میل کا
کرتی ہے مگر اس کا محور سورج کے گرد ہی رہتا ہے۔

اور پھر وہ بوڑھیا رات کے سائے میں اپنی عمر کا سولھواں برس
زندگی کی نالی میں ڈھونڈھتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کاغذ پر
لکھی ہوئی گندی گالی ہو حالانکہ سبق یہ تھا کہ یہ متبرک برس ہے جسے
تمام لوگوں نے سنبھال کر رکھا ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ آج تک اس بھید کو نہ پا سکا
کہ وہ کتنے تھے اور کتنے رہ گئے ہیں، کیونکہ کون کب شامل ہوا اس
بات کا شامل ہونے والے کو بھی علم نہیں اور کون کب بچھڑا اس

بات کا بچھڑنے والے کو بھی علم نہیں۔

بس ایک کارواں ہے جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا اس لئے اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ مسافر اس میں شامل ہوتے ہیں اور ختم بھی اسی میں ہو جاتے ہیں۔

بے چہرہ لوگ

اور پھر جو لوگ چہروں کے بغیر واپس آئے ہیں، ان کو چہروں کے مقابلہ میں کیسے شریک کیا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا چہروں کا مقابلہ ہے اور نقطہ اس آوارہ بادل کی طرح ہے جو ریت کے پہاڑ سے ٹکرا گیا ہو چہروں کی پہچان سے ہی یہاں رشتے ناطے قائم ہیں سلسلے بنتے ہیں تعلقات جنم لیتے ہیں سو دنیا کی لڑائیاں چہروں پر ہیں نقشوں پر ہیں خاکوں پر ہیں نقشہ بدلنے کے لیے جنگیں لڑی جاتی ہیں، گھر اجڑتے ہیں، رشتے ٹوٹتے ہیں، بجا یہاں

ہتھیلی میں پھر جا کر نقشوں کی لکیریں بدلتی ہیں۔

جب یہ عظیم سفر شروع ہوا تھا ہر ایک کے پاس ایک چہرہ تھا ایک وجود تھا اور لوگ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑنے لگے تھے اور راستے سے بھٹک گئے تھے کیوں کہ یہ راستہ دوڑنے کے لئے موزوں نہیں تھا پھر چاروں طرف سے مٹی اور ریت اڑی جس نے انھیں اندھا کر دیا اور وہ ریت ان کے پھیپھڑوں میں بھی پھیل گئی جس کے علاج کے لئے یہ لوگ پہاڑوں پر جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے گئے گئے لیکن بدقسمتی سے جنگل کو چھوڑنے والے اس میں آگ لگا کر گئے تھے پھر بھی سفر کی گرد نے ان کے روپ ضرور بگاڑے تھے لیکن چہرے تو وہی پڑے تھے۔

یہ بھی سچ ہے کہ ساتھ چلنے والے بنجاروں نے بے رنگ چیزیں خرید کر رنگ بیچے تھے اور ان میں سے کئی لوگوں نے کپڑے بیچ کر رنگ خریدے تھے اور کپڑوں کے بغیر جب رنگ بالکل بیکار ہو گئے تو انھوں نے انھیں ایک دوسرے کا منہ کالا کرنے کے لئے استعمال کیا تھا اور سب کے چہرے اس لئے کالے نہ ہو سکے کیوں کہ سب رنگ کالے نہ تھے اور آئینہ نہ ہونے کی وجہ سے سب ایک دوسرے کو کالا منہ والا کہتے رہے چونکہ آنکھیں دھول نے بیکار کر دی تھیں اس لئے ان کے دل میں چھپی ہوئی سیاہی نے ایک دوسرے کو کالا کہا اور یہ سیاہی ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب انھوں نے سورج کو قتل کرنے کا منصوبہ

بنایا تھا۔

جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ستارے جو ایک دوسرے کے قریب دکھائی دیتے ہیں ان کے درمیان کروڑوں میل کے فاصلے ہیں تو انھیں محسوس ہوا کہ اگر وہ رشتوں ناتوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اور وہ پتھر جو انھوں نے آسمان پر خداؤں کو ختم کرنے کے لئے پھینکے تھے وہ فضا میں اٹک گئے ہیں اور انھیں بددعا دے رہے ہیں اور انھوں نے یہ بھی سنا...... کہ ایک دن یہ تمام پتھر برسیں گے اور شیش محلوں کو توڑ کر پرندوں کو آزاد کر دیں گے۔

پھر کئی صدیاں یہ لوگ بند دروازوں کو کھٹکھٹاتے رہے کیونکہ انھیں بتایا گیا تھا جو لوگ ان سے جدا ہوئے ہیں وہ ان ہی دروازوں کے اندر ہیں لیکن ان کی کوششوں کے باوجود یہ دروازے نہ کھلے پھر آخر کار ان کو توڑا گیا لیکن بدقسمتی سے کمرے اندر سے بالکل خالی تھے انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ دروازے باہر کھینچنے سے کھلتے تھے اندر کی طرف دبانے سے نہیں تو اپنی ناکامی سے مایوس ہو کر انھوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا اور مسافروں کا یہ کارواں بھیڑ میں بدل گیا۔ بھیڑ جس کی نہ زبان ہوتی ہے نہ تہذیب ـــــــ جس کی بات نہ کوئی سن سکتا ہے نہ جس سے بات کوئی کر سکتا ہے۔

بھیڑ جس کے لاکھوں کان ہوتے ہیں
لیکن یہ کچھ سُن نہیں سکتی
بھیڑ جس کی لاکھوں زبانیں ہوتی ہیں
لیکن یہ کچھ بول نہیں سکتی
بھیڑ جس کی لاکھوں آنکھیں ہوتی ہیں
لیکن یہ کچھ دیکھ نہیں سکتی

اور پھر جس شخص نے ان دروازوں کے کھلنے کی حقیقت کھولی تھی اور یہ بتایا تھا کہ یہ کمرے تمہارے آرام کے لئے تھے اس کے جسم کو بھیڑ نے اپنے دانتوں سے نوچ ڈالا اور اس کی ہڈیوں کو پاؤں تلے روندا۔

اور جب تپسیا کے بعد دیوتا سانپ کی شکل میں نمودار ہوئے تو سپیرے بین لے کر آگئے اور انھیں قید کر کے لے گئے۔ تپسوی خاموش تماشا دیکھتے رہے اس دن سے لے کر آج تک دیوتاؤں کی یہ نسل بھیڑ کو ڈستی ہے۔

سفر کے آخر میں جب انھیں بہت بڑا آئینہ دیکھنے کو ملا تو انھوں نے ایک دم چہروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ بے شمار چہروں میں یہ اپنا اپنا چہرہ پہچان نہ سکے اور اس وہم میں کہ کہیں دوسرے کا چہرہ نہ لے جائیں۔ انھوں نے اپنے چہرے آئینے میں ہی چھوڑ دیے اور بے چہرہ واپس آگئے۔

ہمت کا چشمہ

جس برتن میں تم نے سورج کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا
تھا اس سے اندھیروں کا ایک ایسا دریا بہہ نکلا ہے جو اپنے سمندر
کی تلاش میں پہاڑوں کے معصوم بچّوں کو بہا کر لے جائے گا۔ اندھی
صدی بچھڑے ہوئے لمحوں کو پکڑنے کی جب بھی کوشش کرے گی، اس
کے ہاتھوں میں ایسے زہریلے ناگ آئیں گے جو آسمان کے اُس حصّے
کو ڈسیں گے جسے سورگ بتا کر دھرتی کے خداؤں نے جگّیں رچائی
تھیں اور پھر تپتی ہوئی برف سے ایک ایسا ٹھنڈا ریگستان پیدا
ہوگا جو چاند کے سینے پر ایسے زخم لگائے گا کہ ہواؤں کے قاتلوں کو
قبروں سے نکال کر زمین کی چھت کے اوپر بکھیر دیا جائے گا اور پھر
اُن بچّوں کو سکون میسّر ہوگا جن کے بچپن کو زمین کی گردش لے کر
بھاگ گئی تھی جن کی چتا درختوں کی چھال نے چھپا رکھی تھی۔

سُورج کا قتل

اس جلوس میں وہ بچہ کب شامل ہوا اس بات کا کسی کو پتہ نہیں،
البتہ اس کی شکستہ رفتار نے سارے جلوس کو رکنے پر مجبور کر دیا۔ ان
تمام لوگوں کو اپنے بچوں سے بچھڑے ہوئے صدیاں گذر گئی ہیں۔ یہی
بات ہے کہ کوئی اسے قتل نہیں کرنا چاہتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر شخص
جب اپنے گھر کے دروازے سے باہر آیا تھا تو اس کے بچے نے چیخ کر
کہا "پاپا میں بھی ساتھ آ رہا ہوں"۔ مگر اسی وقت ان میں سے کسی نے بھی

اس ننھی آواز کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ حالانکہ انھیں کوئی جلدی
بھی نہیں تھی۔ قتل کل بھی کئے جا سکتے تھے۔ لوٹ مار ملتوی بھی ہو سکتی
تھی مگر ان کے لئے اپنے پاپوں سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہی تھا کہ
وہ دھرم یدھ میں مر جائیں۔ دھرم یدھ کرنا ان کے لئے اس لئے
ضروری ہوگیا تھا تاکہ اس میں لڑ کر مرنے کے بعد مکتی حاصل کر لی جائے
بس اسی جلدی نے انھیں دوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ بچہ کہاں
سے گھسا۔ اس بات سے وہ حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔ وہ زور
زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن بچے کی چیخ نے فلک شگاف
نعروں کو بھی خاموش کر دیا۔ اور وہ جلوس بے بس ہو گیا۔

وہ تمام اپنے کاندھوں پر ہتھیار رکھ کر ایک دوسرے
پر ہتھیار رکھنے کا الزام لگا رہے تھے اور حملہ آوروں کو روکنے کیلئے
ایک دوسرے پر حملہ کرنے جا رہے تھے۔ اعلان یہ تھا کہ پیچھے دیکھنا
جرم ہے سب کو آگے بڑھنے میں مصروف دیکھ کر اس شخص نے جب
پیچھے کی طرف نظر دوڑائی تو اسے اپنی زبان پر کنٹرول نہ رہا۔ اور
بھیڑیے کی کہانی کے یہ لفظ اس کی زبان سے پھسلے "اگر تمام حملے جنگ
کو روکنے کے لئے ہی کئے جاتے ہیں تو پھر جنگ کا آغاز کون کرتا ہے"۔
اس کے ساتھ جلوس کے انصاف [illegible] بیان کیا "قانون بہرہ
ضرور ہے مگر اندھا نہیں"۔ ہم نے خود اس کو پیچھے دیکھتے ہوئے
دیکھا ہے اور اس نے اپنے گھر کے رستوں کو اس وقت یاد کیا جبکہ

رشتے ختم کرنے کے لئے ہم آگے بڑھ رہے تھے....

جنگ ابھی جاری ہی تھی کہ وہ سمجھنے لگے کہ شکست ان کا مقدر بن گئی ہے۔ اور کوئی بھی جیت نہیں سکتا۔ جو بھی اس میدان میں گیا وہ ہار کر ہی واپس آیا۔ انھیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہارنے کے لئے اتنی بڑی جنگ کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ اپنی غلطی کو چھپانے کے لئے انھوں نے غصہ کا سہارا لیا۔ اور سورج پر الزام لگایا کہ وہ ان سے دھوکہ کرتا ہے لہٰذا سب سے پہلے سورج کو قتل کیا جائے بس اس کے بعد اندھیری رات میں سورج کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جانے لگا اور یہ اعلان کیا گیا کہ بچوں کو اب یہ سبق نہیں پڑھایا جائے گا کہ سورج ہمیں روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ یہ بات سنتے ہی سب کو اپنے گھر کی یاد آنے لگی بچپن یاد آنے لگا اور سورج پر ان کا غصہ اور تیز ہونے لگا۔ ان میں سے ایک نے کہا "سورج کو اگر قتل کرنا ہے تو پہلے آسمان سے دوستی کرنی ہوگی بلکہ نہیں بھی تو آسمان کو فتح کرنا ہوگا" دوسرے نے جواب دیا "اگر ہم بھلا وہاں تک پہونچیں گے کیسے؟" "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم پاؤں کٹوا دیں تاکہ ہم ہوا میں اڑ سکیں" لہٰذا ان تمام لوگوں نے اپنے پاؤں کٹوا دئے اور اپاہج ہو گئے۔ جونہی پاؤں کٹوانے کا کام مکمل ہوا، ہوا نے اعلان کیا "میں تو خود زمین کا حصہ ہوں، تمہیں آسمان تک کیسے لے جاسکتی ہوں،" اب لوگوں کو یہ منصوبہ بوجھ محسوس ہونے لگا اور وہ تمام حضرات سخت پریشان

ہو گئے۔

"کیوں نہ یہ منصوبہ ترک کر دیا جائے۔ اور ہتھیار پھینک کر کم از کم کاندھے تو آزاد کر دیئے جائیں تاکہ گھر جا کر بچوں کو پاؤں میں روندنے کے بجائے ہم کاندھوں پر اٹھا سکیں۔" ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا "مگر یہ تو منصوبے کے خلاف ہی نہ۔ اور منصوبہ کے خلاف سچ بھی نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ بچہ اہل جلوس کو نظر آ رہا ہے "لیکن یہ بچہ آیا کہاں سے "یہی تو سمجھ نہیں آتی۔" "کیوں نہ اسے پکڑ کے اس کے ماں باپ کے حوالے کر دیا جائے۔" "یہی بہتر ہوگا۔" سب نے اس بچہ کو پکڑنا شروع کر دیا۔ ہر ایک آدمی کے ہاتھ ایک بچے پر ہی۔ ان تمام بچوں کی شکل ایک جیسی ہے پھر انھیں خیال آیا کہ ان کے گھر بھی ہیں اور آنگن بھی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ ہر آدمی کا بچہ شروع میں ہی اس جلوس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا لیکن انھیں حکم آگے دیکھنے کا تھا اور بچوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے اپنے ہی پاؤں نے ان بچوں کو روندا ہے کیوں کہ ان کے کاندھوں پر ہتھیار تھے۔ اب انھیں یقین ہوا کہ ایک دوسرے سے جنگ کی وجہ سورج کی روشنی نہیں بلکہ آنکھوں کا اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے کا جنم اس وقت ہوا تھا جب انھوں نے ستاروں سے روشنی چھین کر اپنے آنگنوں کے جگمگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں اور بچے خاموش کھڑے ہیں۔ ہوائیں یہ پیغام لائی ہیں کہ تمہاری بیویوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ "تم سب بچوں کے قاتل ہو" وہ حیران ہو گئے کہ آخر انھوں نے یہ ہتھیار کیوں بنائے۔ حالانکہ ان کے اپنے گھروں کی چھتوں میں سوراخ تھے جن سے بارش کا پانی ٹپک کر آتا تھا جنھیں بند کرنے کی انھیں تمام زندگی فرصت ہی نہیں ملی۔

گولائی

وہ دائرے کی گولائی ناپنے کے لئے اُس کے گرد گھومنا شروع کر دیتا ہے اور اسکے گرد گھومتا ہی رہتا ہے مگر ہر بار وہ اِس بات کو بھول جاتا ہے کہ وہ کتنا چلا ہے اور آگے کتنا اور چلنا ہے۔

دراصل وہ اِس بات سے تنگ تھا کہ جب بھی کبھی وہ خاموش ہوا اُس پر گالیاں دینے کا الزام لگ گیا اور اگر وہ کچھ بولا

تو اُسے گونگا کہا گیا اور وہ آوازیں جو اُس نے دوسروں کو بلانے کیلئے لگائیں تھیں اُن میں اپنا نام بھول گیا ہے اور اُسے اب اپنی پہچان مشکل لگنے لگی ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لئے اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ ہر چیز کو جان لے کیونکہ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو بھی جان لے گا۔ وہ عجیب تضاد میں پھنس گیا ہے۔

اصل میں لوگوں نے جب ہوا کو نگلنے کے لئے سانس اندر کی طرف لینے شروع کر دیئے تو ہوا نے سب کے جسم کے حصے اڑا دیئے۔ ہوا یہ کہ لوگوں کے جسموں کے حصے ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ گئے۔ اُسکے بعد سے لیکر آج تک ہم میں سے ہر شخص پورا تو ہے مگر مکمل نہیں اور ہر ایک کے ہاتھ اُسکے پاؤں سے لڑ رہے ہیں اور دانتوں سے چبائی ہوئی خوراک پیٹ ہضم نہیں کر رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ دائرے کی گولائی جاننے کے بعد وہ ہر چیز جان لے گا۔

سفر اُس نے یہ سفر کب سے شروع کیا کہ اس بات کا اُسے کوئی پتہ نہیں بس وہ چلنے میں مشغول تھا کہ اچانک ایک دن وہ چونک گیا۔ راستے نے اُس سے پوچھا "میں تمہیں کہاں لے چلوں"، وہ گھبرا گیا کیونکہ اُسے بتایا گیا تھا کہ راستے خود بخود منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے ذریعہ اُس نے اِس چیز کے خلاف احتجاج کیا مگر پاؤں نے راستے کا ساتھ دیا اور سفر پھر بھی جاری رہا۔ وہ اب مجبور بھی ہو گیا کیونکہ بد قسمتی سے اب وہ بول ضرور سکتا تھا مگر کچھ کہہ

نہیں سکتا تھا۔ کہنے اور بولنے میں کتنا فرق ہے یہ وہ صرف زبان سے بولنے، آنکھوں کے دیکھنے کانوں کے سننے، پاؤں کے چلنے کا نام ہی ہے یا وہ بھی کہیں پر ہے۔ اس نے پھر اپنی تلاش شروع کر دی۔

اُسے معلوم ہے کہ آنکھیں اُسے دھوکہ دیتی ہیں مگر پھر بھی اُسے آنکھوں کے ذریعہ ہی دیکھنا پڑتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کانوں کو جھوٹ سننے کی عادت ہے مگر مجبور ہے کیونکہ انہیں اگر وہ اتار کر پھینک دے تو بہرہ ہو جائے گا۔

آخر ایک دن تنگ آ کر اس نے آسمان سے پوچھا "میرے ہونے کا مجھے فائدہ کیا ہے۔ بس، کان، آنکھیں، ٹانگیں، ہاتھ، پاؤں جب ملے تو میں بن گیا۔ اور ٹانگیں تبھی چل سکتی ہیں جب یہ جسم کے باقی حصوں کے ساتھ ہوں۔ آنکھیں تب دیکھتی ہیں جب یہ چہرے پر لگی ہوئی ہوں۔ لگتا رہا ہے یہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ سے کٹ کے ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہیں اور میں بن جاتا ہوں اور پھر یہ تمام چیزیں ایک دن مر جاتی ہیں، کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں لیکن میں، زندہ رہتا ہے اور میں تڑپتا ہے۔ گیہوؤں، کوچوں، کھڑکیوں کے اندر جھانکتا ہے اور سکون کے لئے ہر کسی دوسرے بدن کے اندر جب نکلتا ہے تو وہاں پر پہلے ہی ایک دوسرے میں کر موجود پاتا ہے۔

اُسے اب یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو دوسروں کا

بوجھ اُٹھاتی ہے اُس کا اپنا بوجھ بھی اُتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ بوجھ اُٹھاؤ یا نہ اُٹھاؤ، اِسکے وزن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اُسے یہ بھی محسوس ہوا کہ ہزاروں میل چلنے کے بعد بھی وہ بوجھ جو اُسکے سر پہ تھا ایک گرام بھی کم نہیں ہوا۔ یہ سوال جب اُس نے پوچھے تو اُس کو بتایا گیا کہ یہ سب جاننے کے لئے دائرے کی گولائی جاننا ضروری ہے۔ پتھر کے بُت نے اُسے اتنا بتا دیا اور خاموش ہو گیا۔ وہ صدیوں چلتا رہا مگر ایک لمحے کا فاصلہ بھی طے نہ کر سکا۔ اُس نے دیکھا کہ جس بُت پر اُس نے اعتبار کیا تھا وہ تو ٹوٹ رہا ہے۔ اُس نے اعلان کیا "میں اب دائرے کے گرد گھومنا نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی وہ گھومتا ہی رہا۔ اُسنے اپنے ساتھیوں کو آواز دی "ٹھہرو" مگر اس دور میں لوگوں کو ایک دوسرے کی آواز سُننے کی فرصت ہی نہیں۔

اُسے لگا کہ ہر چکر کے بعد اُس نے اپنے گرد ایک نئے دائرے کو جنم دیا اور اب وہ لاکھوں دائروں میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے۔ دائرے اُسے گھما رہے ہیں۔ وہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے یہ سارا سفر ایک دھوکہ ہے۔ اِس کی کوئی حقیقت نہیں، اِسلئے جہاں بھی رُکو کھلی سانسیں لے لو۔ مگر خود گھومنے میں مصروف ہے۔

رشتے

رشتے کب پیدا ہوئے۔ یہ جاننے کی کسی کو اس لئے فرصت
نہیں کہ یہاں تو لوگ رشتے توڑتے اور جوڑتے ہوئے ہی زندگی گزار
دیتے ہیں۔ رشتوں کا سنسار ایک ایسا بَن ہے جس میں خوبصورت
خواہشوں کی آہوتی پڑتی ہے۔ رشتوں کو ہر خبر چُبھتی ہے۔ خوبصورت
جسموں کے نازک اُبھار آنکھوں کو تو اچھے لگتے ہیں مگر رشتوں
کو چُبھتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے اوپر ایک خول ہے جسے ہم ماں،

بہن، باپ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اندر بھر کوئی اسی خول میں بند ہے خوبصورت جسم ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ رسمیں، رواج، ہتھکڑیاں ہیں جو ہم نے اپنی باہر کو خود بنا کر پہنے لیتا ہے پرارتھنا کی ہے کہ ہمیں مکتی چاہیئے، ہمیں آزادی چاہیئے۔

مہا بھارت کی جنگ میں جو لوگ مرے انہیں مکتی مل گئی مگر رامائن کی جنگ کے بارے میں کتابیں خاموش ہیں۔ راون کو مکتی اس لئے ملی کیونکہ اس کی موت رام کے ہاتھوں سے ہوئی اور رام کا اوتار بھی راون کو مارنے کے لئے ہی ہوا مگر کمبھ کرن کے بارے میں کتاب خاموش ہے "کتاب پڑھنے کے لئے ہے سوال کرنے کے لئے نہیں،" میں نے اپنے آپ سے کہا اور یہ بھی سچ ہے کہ مہا بھارت میں یہ بھی لکھا ہے کہ دھرم یدھ میں مرنے والے ہر شخص کو مکتی مل گئی۔ لیکن رامائن کی لڑائی تو مہا بھارت سے پہلے ہوئی اور کرو کشیتر کی کھدائی کرنے والوں کو بہت سے ایسے انسانی پنجر ملے جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس لڑائی میں بہت سے لوگ زیادہ تر بھی ہر گئے تھے تو مطلب، صاف ظاہر ہے کہ مرنے والوں کو تو مکتی مل گئی مگر ان بھولوں کا کیا جن کے جسم کے بائیں حصے واپس نہیں ملے۔ لگتا ہے کہ اس جنگ کی وجہ بھی رشتے ہی تھے، رشتے نہ ہوتے تو جھگڑے نہ ہوتے۔

"رشتے کہاں رہتے ہیں؟" "دیواروں کے اندر" اور بچے نے جواب دیا۔ کنواری خواہشوں کو یہ اپنے اندر اس طرح غلط ملط کر دیتے

ہیں کہ باندی کے چاہنے والے روشنی کے سوداگر بن جاتے ہیں۔ اور آواز کا جادو جگانے والے لفظوں میں قید ہو جاتے ہیں۔

رشتے بڑے بے وفا ہوتے ہیں۔ رامائن کی پوری رچنا رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے کی گئی۔ مگر جس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے راون کو مارا گیا اُسے دھوبی کے لفظوں نے توڑ دیا۔ ہر روز رات کو جب بھی سوتا ہوں تو میرے ساتھ ایک بچہ بھی آکر سوتا ہے۔ وہ کون ہے اور کہاں سے آتا ہے مجھے اس بات کا پتہ آج تک نہیں لگ سکا۔ پہلے پہل میں اس سے ڈرتا تھا مگر اب میری عادت بن گئی ہے۔ وہ رات کو بڑبڑاتا ہے۔ اس کی آواز کچھ یوں سُنائی دیتی ہے، "کہاں راون کہاں دھوبی"۔

آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ میں چھوٹا ہو رہا ہوں اور وہ بچہ بڑا ہو رہا ہے۔ جب میں نے اس چیز کا سبب جاننا چاہا تو بستر پر سلوٹیں پڑ گئیں اور سامنے لگی ہوئی رام جی کی تصویر کی جگہ کرشن جی کی تصویر آگئی اور مجھے وہ کتھا یاد آنے لگی جس میں یہ لکھا ہے کہ رام جی نے گیتا کا اپدیش دینے کے لئے ہی کرشن اوتار لیا تھا۔ میرے دل کے اندر سے دریا پھوٹا اور یہ لفظ یہ کہہ کر بہہ گئے کہ گیتا کا اپدیش تو رامائن کی لڑائی ہی میں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اپدیش دینے کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے "یدھ اور بھگوان" پھر مہابھارت کے یدھ کی رچنا کیوں کی گئی۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ جوں جوں وہ بچہ بڑا ہو رہا ہے میں چھوٹا ہو رہا ہوں اور مجھے بڑبڑانے کی عادت پڑ رہی ہے۔ یہ زمین ہے جو گھومتی رہتی ہے۔ یہ درخت ہیں جو کھڑے رہتے

دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام دھاگوں کو آخر ایک دن ٹوٹنا ہے۔ مگر اصل
دھاگے کو اپنے ٹوٹنے کا اس لئے غم نہیں کیونکہ دھاگہ صرف دھاگہ ہے
یہ نہ لمبا ہے اور نہ چوڑا ہے۔ یہ تو لوگ ہیں جو لمبائی اور چوڑائی ناپتے ہیں
اور گھڑیوں کی گنتی کا حاصل صرف دن، رات اور موسم ہیں جو فصل اُگاتے
بھی خود ہیں اور کاٹتے بھی خود ہیں جس شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ اگر ہماری
عمر مقرر ہے تو ہمیں بتائی کیوں نہیں جاتی۔ اسے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ ستارو
کو گننے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی سوچ میں پھیلاؤ آئے گا اور انسانوں
کی تفریق اس لئے جاری رہے گی کیونکہ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم یہ سب
گنتی کے حصے ہیں اور گننا انسان نے خود اپنایا ہے لہذا تفریق سے نفرت
مناسب نہیں۔ پھول خوشبو دے رہے ہیں اور انسان انہیں گن رہا ہے
ستارے روشنی دینے میں مصروف ہیں اور آدمی ان کی گنتی کر رہا ہے
اس شخص نے عاجزی سے کہا۔ "میرے خواب کو خواب ہی رہنے
دیا جائے" "مگر کیوں"، اندر کے آدمی نے سوال کیا "کیوں کہ خواب اگر
حقیقت بنیں گے تو پھولوں کو مرجھانا پڑے گا اور سب کو معلوم ہو جائے
گا کہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں کا بدن سخت اور کھردری چٹانوں
کا بنا ہوا ہے" لیکن خواب کا تو کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مگر وجود حقیقت
کا بھی کب ہوتا ہے۔ ہر حقیقت کو آخر گذرتے ہوئے خواب میں بدلنا ہوتا ہے
مگر ایسا کرنے سے پہلے وہ ہوا کے سینے پہ زخم چھوڑ جاتی ہے" اور پھر
وہ شخص تمام رات پتھروں سے اپنے گھر کی کھڑکیاں توڑتا رہا تا کہ اسے

چاند سا چہرہ نظر آئے۔ صبح ہونے تک شیشے ٹوٹ گئے مگر یہ اُسے
بعد میں معلوم ہوا کہ چاند دن کو نظر نہیں آتا۔ اور رات کو لوگ گھروں
کی کھڑکیاں بند کر کے سوتے ہیں۔

ہر خواب کو رشتے بکھیر دیتے ہیں۔ آرزوؤں کو دفن کر کے یہ
دھول کے پھول پیدا کرتے ہیں اور انسان پر الزام لگاتے ہیں کہ اب
اس کی ناک میں خوشبو سونگھنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ بڑی بڑی جنگیں
یا تو رشتوں کو قایم رکھنے کے لئے لڑی گئیں یا مٹانے کے لئے۔ مگر
اصل میں ان کی حقیقت لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ رشتے ہیں جو
قایم رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو مٹتے رہتے ہیں۔

نروان

اسے ایک دن اچانک رکنا پڑا کیوں کہ اسکے سائے نے کہا کہ وہ اُس کے قریب آ دھلے ہے۔ وہ اپنے سائے کے ساتھ ہی مکمل انسان تھا مگر ایک بار وہ روشنی سے ہار گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سایہ اس سے الگ ہوا تھا اور روشنی سے جنگ کا اعلان اس نے سوکھے ہوئے سمندروں کے کہنے پر کیا تھا جنھوں نے اسے بتایا تھا کہ اگر وہ روشنی سے جیت گیا تو اُس کے پاؤں کو پانی میں تیرنے کی اجازت

بخشی جائے گی اور اگر وہ ہار گیا تو اس کا سایہ اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ مگر یہ راز ہواؤں نے بعد میں افشا کیا کہ سوکھے ہوئے سمندر محض اپنے گھاؤ بھرنے کی خاطر دوسروں کو لڑاتے ہیں اور روشنی سے ہارنا اس کا لازمی تھا کیوں کہ اس کی آنکھوں کے اندر سورج نے اپنا گھر بنایا ہوا تھا۔ شام ہوتے ہی سورج کی آنکھوں کے اندر چھپ کر اندھیرا کر دیتا تھا۔ ہوا یہ کہ اس کا سایہ اس سے الگ ہو گیا اور تڑپ اس کا مقدر بن گئی۔ اب وہ اپنے سائے کی تلاش میں آگے بھاگ رہا ہے اور اس کا سایہ اس کے پیچھے اور کروڑوں میل دوڑنے کے بعد فاصلہ ایک انچ بھی کم نہ ہو سکا۔

مگر ہوا یہ کہ وہ تو رک گیا مگر اس کے پاؤں نہ رک سکے اور اپنے ساتھ وہ آوازیں بھی لے گئے جو اسے ہر موڑ پر راستہ بتاتی تھیں اور وہ سفر کرتا تھا۔ یہ وہ آوازیں تھیں جو شروع میں اسے دے کر سفر کیلئے روانہ کیا گیا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ پاؤں تو اس کے بدن کے ساتھ لگا دیئے گئے مگر ان کا کنٹرول کسی اور کے پاس رہا۔ اسے یہ جان کر دھکا سا لگا۔ اسے اپنے ساتھ اتنے بڑے دھوکے کی امید نہیں تھی۔ اور پھر یہ دھوکا اس نے خود ہی اپنے ساتھ کیا تھا کیوں کہ اس نے اپنے ساتھ کے آدمی کو وہیں پر چھوڑ دیا تھا۔

سفر میں ہر لمحے نے اس کے دل کے اندر ایک آرزو کو جنم دیا

تھا۔ اب اس نے انھیں پھینک دیا اور وہ کچھ ہلکا ہو گیا۔ مگر اتنا ہلکا ہو گیا کہ اب ہوا بھی اسے اپنے ساتھ اڑا سکتی تھی۔ وہ خوش ہوا کہ وہ اب ہوا کے ساتھ اڑے گا۔ خلاؤں کی سیر کرے گا اور جو ستارے اور سیارے اسے دور سے نظر آتے تھے، اب قریب جا کر انھیں دیکھے گا، انھیں پرکھے گا۔

مگر وہ یہ جان کر حیران ہو گیا کہ نہ چاہنے کے باوجود زمین پر رہنے کی خواہش اس کے دل کے اندر پیدا ہو گئی۔ وہ پریشان ہو گیا کیونکہ اسے معلوم ہو گیا دل تو اس کے جسم کے ساتھ لگا دیا گیا ہے مگر اس کا کنٹرول ابھی کسی اور کے پاس ہے۔ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ ہاتھ تو اس کے ہیں مگر ان پر کنٹرول کسی اور کا ہے اور اس کے کان اسکی آواز نہیں سُن سکتے۔ اس کی آنکھیں اس کے زخم نہیں دیکھ سکتیں۔

پھر اس کو خیال آیا کہ اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا خوبصورت چہرہ پیلا پڑتا گیا اور اس کا بچہ پاپا پاپا کرتا تھک گیا تھا مگر وہ برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا رہا تھا۔ وہ جنم مرن کے چکر سے مکتی چاہتا تھا۔

دائرے کی گولائی کے خلاف لڑنے والی سیدھی لکیریں بھی دائرے کا ہی ایک حصہ تھیں اور یہ لڑائی بھی دائرے کے وجود کے لئے ہی ضروری ہے۔ اندھیرے اور روشنی کے چکر سے مکتی حاصل کرنے والے شخص کو دن اور رات مل گئے۔ عجیب سلسلہ ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود اگر چیزیں کھوئی

پڑتی ہیں تو نہ چاہنے کے باوجود حاصل بھی کرنی پڑتی ہیں۔

حالانکہ درخت نے اسے مشورہ بھی دیا تھا کہ تم تو بیٹھ کر تپسیا کر رہے ہو مگر میں تو صدیوں سے ایسا ہی کر رہا ہوں مگر اس کے باوجود میرے جسم پر نئے پتے اگتے ہیں، اور پرانے پتے گرتے بھی ہیں جب وہ تھک گیا تو اس نے اعلان کیا "مجھے گیان حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے نروان پراپت کر لیا ہے۔"

اتنے میں اس کا دوسرا ساتھی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا "تم واپس کیوں آئے ہو؟" "میں واپس تو نہیں آیا۔ میرا سفر تو ابھی جاری ہے۔" "مگر تم واپس کیوں آئے ہو؟" اس نے بھی وہی جواب دیا۔

وہ دونوں حیران ہو گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ سفر کے خلاف بغاوت شروع کر دی گئی ہے۔ اب ہم اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے بلکہ ایک دوسرے کے بکھرے ہوئے لمحے اکٹھے کرنے میں مدد کریں گے۔

مگر وہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ راستے نے دو حصوں میں بٹ کر الٹے سمت میں چلنا شروع کر دیا۔

قیدی

وہ جب بھی ہوا میں اُڑنے کی کوشش کرتا ہے اُسکے پاؤں
زمین کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اُسے محسوس ہوتا ہے
کہ اُسکے پاؤں زمین کے نیچے جا رہے ہیں اور اُس کا سر اُوپر ہوا
میں اُڑ رہا ہے اور جسم کے درمیان کا حصّہ بیچ میں لٹک رہا ہے
مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی قائم رہتا ہے۔ اُس کے بازو اُس
سے کب الگ ہوئے، اُسے کچھ یاد نہیں مگر اتنا وہ جانتا ہے کہ اُسکے

بازو اُس سے الگ کر کے گوشت کی دو لاٹھیاں اُسکے کاندھوں پر چپکا دی گئیں کیونکہ اب وہ کسی کی مرہم نہیں کر سکتا، البتہ قتل ضرور کر سکتا ہے وہ اتنا یاد کر سکتا ہے کہ ایک بار اُس نے اپنے بازوؤں سے خوبصورت جسم کے سر کے اوپر رکھا ہوا امرت کا گھڑا اُتار کر غٹا غٹ پینے کی خواہش کی تھی حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ خوبصورت لڑکی اپنی گہری آنکھوں سے جس چہرے کو دیکھتی تھی، اُسکے دل کے اندر امرت پھوٹ پڑتا تھا۔ قصور اُس کا بھی کوئی نہیں تھا مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ آنکھوں کے بہکاوے میں آ گیا۔ آنکھیں کبھی خود نہیں بہکتی مگر پورے جسم کو بہکا دیتی ہیں۔ آنکھوں کے ہر قصور کی سزا چہرے بھگتتے ہیں آنکھیں شرمسار نہیں ہوتی بلکہ چہرے کو شرمسار کرتی ہیں۔ کتنی چالاک ہیں یہ آنکھیں جو پہلے بہکاتی ہیں اور پھر شرمسار کرتی ہیں۔ یہ جب بھی کبھی خوبصورت چہروں سے اُلجھتی ہیں تو پاؤں ٹھہر جاتے ہیں اور جسم رُک جاتا ہے اور الزام یہ لگتا ہے کہ یہ دوسرے کے کھیت کی کیاری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اوپر اٹھنے کا حکم اُسے آسمان کی طرف سے نہیں ہوا اور زمین تو اپنے اندر کشش رکھتی ہے۔

ایک بار اُس نے اوپر دیکھا تھا تو اُسکی آنکھوں نے ستارے توڑ کر آسمان کو ننگا کرنے کی خواہش کی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ اُس کا سر اوپر اُٹھ گیا تو اُس نے اعلان کیا کہ اُسے سورج نظر آنے لگا

اور وہاں اب پہنچ ہی جائے گا اور سب کو وہاں پہنچا دیا جائے گا
اور یہ سُن کر تمام لوگوں نے اپنے سر ہوا میں اُڑانے شروع کر دئے،
مگر اُن کے پاؤں پیچھے زمین کی دلدل میں پھنس گئے۔ اور انکے دھڑ
درمیان میں لٹک رہے ہیں۔ آدمی جب بٹ جاتا ہے تو لڑنا شروع
کر دیتا ہے۔ پورا آدمی کبھی لڑتا نہیں اور انسان کو لفظوں نے رشتوں
میں بانٹا ہے اور لکیروں نے ملکوں میں۔ تمام جگہیں لفظوں اور لکیروں
کے لئے رہی ہیں۔ شروع میں انسان لفظ بولتا تھا مگر اب لفظ انسان
بولتے ہیں۔ پہلے انسان لکیریں کھینچتا تھا اب لکیریں انسان کھینچتی
ہیں۔ اسکے باوجود علم کا دعویٰ جاری ہے۔

اور پھر بٹے ہوئے انسانوں کے سر آپس میں لڑ رہے ہیں۔
پاؤں ایک دوسرے کو باہر نکالنے میں مصروف ہیں اور دھڑ آپس میں
ٹکرا رہے ہیں۔ کسی کو اب آگے بڑھنے کی فرصت ہی نہیں اور زمین اُن
سے کافی آگے نکل چکی ہے مگر دلدل وہیں قائم ہے۔

کھلونے اس وقت توڑ دیئے گئے جب بچپن کی پگڈنڈیاں
زندگی کی کھلی سڑکوں میں بدل گئیں اور سڑکوں کے دونوں طرف
کھڑکیاں کھلی ہیں۔ جوان سڑکوں پہ جوان کھڑکیاں! جوان چہرے
وقت کے بطن سے ماضی کی دھند تو ہمیشہ سے یہ اٹھتی ہے اور اسی
دھند میں بچپن کے خواب پرندوں کے گھونسلوں کے تنکوں کی طرح
بکھر جاتے ہیں۔ اور بکھرے ہوئے لمحے سہم سہم کر ان کھڑکیوں کے

پیچھے سے حبا نکلتے ہیں۔

یہ بھی ایک سلسلہ ہے کہ ریت کے گھروں کو چھوڑ کر پتھر کے مکانوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ حالاں کہ ریت اور پتھر کی بنیاد ذرے ہی ہیں۔ مگر دونوں کی فطرت میں کتنا فرق ہے۔ ریت بکھر جاتی ہے۔ مگر پتھر ٹوٹ سکتا ہے بکھر نہیں سکتا۔ اس کا بھید صرف ٹھہرے ہوئے پہاڑ اور بہتے ہوئے پانی ہی جان سکتے ہیں۔ جو بے زبان ہیں۔

پھر اس دن باقی دنوں کی طرح دھوپ سفید نہیں تھی۔ الف نے دروازہ کھولا اور کہنے لگا۔ یہ خوبصورت لمحے ہیں تمہارے لئے لایا ہوں اور انہیں میں نے ریت کے گھروں میں اگتے خوبصورت شبنمی پھولوں کی پتیوں سے چرایا ہے۔ یہ بچپن کے خوبصورت لمحے ہیں۔ تم انہیں بڑھاپے کے کھیتوں میں پھینک دو۔ خوابوں کی فصل پیدا ہوگی۔ یہ سنتے ہی اس نے کہا الف! تمہیں شاید معلوم ہی ہوگا۔ لمحے وقت کے درختوں پر پتوں کی طرح کھلتے ہیں۔ پھر گر جاتے ہیں۔ اور مر جاتے ہیں سپنوں کی فصل بوئی نہیں جاتی بلکہ خود بخود اگتی ہے تم ان مردہ لمحوں کو میرے پاس لے آئے ہو۔ میں تمہاری خوشی کے لئے قبول کر لیتی ہوں۔ لیکن ماضی کے اس غار میں پھینک دوں گی، جہاں سے تم انہیں دیکھ نہ سکو۔ کیونکہ تم شاید یہ نہیں

رشتہ تنے پر پیدا ہونے والی ٹہنیوں کی طرح ہے زندگی بھی تو آگے

بڑھنے کا نام ہے اور وہ ندی جس میں، میں اور تم ہی نہیں بلکہ ہم سب نہایا کرتے تھے۔ اس کے کنارے ننگی نہانے والی عورتوں کو دیکھ کر صرف اتنا محسوس ہوتا تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان صرف یہ رشتہ ہے کہ عورت، عورت ہے اور مرد، مرد ——

رشتوں ناطوں کا سوداگر اپنی آنکھوں کو ان سوراخوں میں بھول آیا جن میں سے خوبصورت لڑکیوں کو لڑکے چھپ چھپ کر دیکھا کرتے تھے اور اپنے کانوں کو اس ایک لفظ پر قربان کر چکا ہے جو سب سے پہلے ۲۱ سال کی کنواری لڑکی کے منہ سے اپنے عاشق کے لئے نکلا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رشتوں کے بیوپار میں گھاٹے میں رہا۔ اس کی آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے کان ہیں مگر وہ سن نہیں سکتا۔ اور کوئی بھی شخص اس کی بات پر اعتبار بھی نہیں کرتا۔ ویسے اس شہر کا ہر شخص رشتوں کا بیوپاری ہے اور گھاٹے کا سودا کرتا ہے ایسا اس لئے ہے کہ لوگ آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی دیکھ نہیں سکتے اور کانوں کے ہوتے ہوئے بھی سن نہیں سکتے۔

بے معنی صدا

آخر میری ضد سے تنگ آ کر پہاڑوں نے کہا وہ تم جو صدیوں سے
ایک ہی سوال کو دہرا رہے ہو کر برف کیوں پگھلتی ہے اپنے اندر کے آدمی سے
یہ بھی پوچھو کہ پانی کیوں جم جاتا ہے اور تمہیں شاید یہ بھی علم ہو گا کہ عمر کے بڑھتے
ہوئے برس اپنے اندر رشتوں ناطوں کے پھول وقت کے درخت کی ٹہنیوں پر
کھلاتے ہیں اور ان سے نئے بیج پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ برس خود صدی میں کھو
جاتے ہیں اور صدی اتنے دیس مہینوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے برس مہینے

دن گھنٹے، لمحے اپنے اندر لامحدود کہانیاں رکھتے ہیں۔ اور ایک ایک کہانی میں لاکھوں کردار ہوتے ہیں مگر ان سب کا انجام صرف یہ لفظ ہیں صدی گذر گئی، اور پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ریت جسے ہم نے دوسروں کی آنکھوں پر پھینکنے کے لئے اکٹھا کیا تھا اس نے ان ننھے چشموں کا پانی اپنے اندر جذب کر لیا۔ جسے ہم نے نوجوان تیاگی سادھوؤں کی دھوتیوں پر خوبصورت سے دوپٹوں کا رنگ چڑھانے کے لئے استعمال کرنا تھا اور یہی بات ہے کہ ننگے بدنوں والے یہ سادھو اب کپڑوں کی تلاش میں خوبصورت جسموں کو ٹٹولتے ہیں اور مسافروں کا وہ کارواں جو پھول توڑنے کے لئے چلا تھا، اس کے مسافروں کے پاؤں سے نازک راستوں پر ایسے نشان پڑے کہ وہاں سے اُگنے والے کانٹوں کے درختوں نے وہ لمحے زخمی کر دیئے جو ہواؤں نے کنواری لڑکیوں کے لئے محفوظ رکھے ہوئے تھے، اور پھر خلا سے اٹھنے والی بے معنی صدا یہ کہہ رہی ہے کہ دنیا کے تمام فلسفوں کا مقدر الف سے لیکر ےیٰ تک حرف بن جاتا ہے اور ان حرفوں کو کھول کر سیدھی لکیریں بنتا ہے اس لئے لفظوں کی جنگ لڑنے والے سوداگروں سے کہہ دو کہ خوبصورت لمحوں کو سمیٹ لو ورنہ صدی انکو کھا جائے گی۔

وجود کی جنگ

ایک دن اس نے اپنے آپ سے بغاوت کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ پہاڑوں کے وجود کو ختم کرنے کی راہ میں صرف اس کا اپنا وجود ہی حائل ہے۔ پہلے اسے اپنے وجود کو ختم کر کے اپنے آپ کو آزاد کرنا ہے اس نے دوڑنا شروع کر دیا مگر کوشش یہ کی کہ اس کے پاؤں آہستہ چلیں۔ وہ تیز بولنے لگا مگر اس نے کوشش یہ کی کہ لفظ اس کی زبان سے آہستہ نکلیں۔ اس نے تمام رشتوں ناطوں سے بغاوت کر دی، بیوی کو بہن اور ماں

کو بھی بھی کہا مگر اس کے باوجود اس کا دل نہ بھرا۔ اس نے سورج کو پتھر سے توڑنے کی کوشش کی، اور شہر میں زور سے چیخا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
سورج زمین کے گرد گھومتا ہے اور چونکہ سب ستارے ایک دوسرے کو کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں مگر اس کے باوجود اسے چین نصیب نہ ہوا اور اس کے آنگن میں کھلے ہوئے پھول کانٹوں کی مانند اسے چبھتے رہے۔ اس نے تیزی سے دریا میں چھلانگ لگائی اور ایک صدی تک پانی میں ہی ڈوبا رہا، مگر اس کے باوجود پیاسا رہا۔

درا صل وہ اپنا ایک الگ وجود بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ راتوں کو جاگا اور دنوں میں سویا رہا، کیونکہ اسے کسی دھارمک ودوان کیتھی سادھو نے بتایا تھا کہ اگر تم اپنے آپ کو سمجھنا چاہتے ہو تو اپنا ایک الگ وجود بناؤ، اور اس انفرادیت میں تمام کائنات کو سمیٹ لو۔
ست یگ سے لیکر کل یگ تک وقت کو گٹھڑی میں باندھ کر ایک لمحے کے اندر گرفتار کر کے آسمان پر پھینک دو، اور جب پھر وہ پھٹے گا تو آسمان کا کوئی وجود نہ رہے گا۔
کیونکہ ان لفظوں نے جو بعد میں فلسفے کہلائے، یہ بات اس کے ذہن میں بٹھا دی تھی کہ اگر تم اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہو تو اپنا ایک الگ وجود بناؤ، اس کے لئے چاہے تمہیں پوری دنیا کا قتل کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی انفرادیت کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کئی جنگوں کا اہتمام کیا، جن میں

انسانیت کا قتل ہوا۔ ہڈیوں کے انباروں کو جانوروں نے روندا۔

لیکن پھر وہ گھبرا گیا کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ سب کو قتل کر دے اور اس کے بغیر کوئی بھی زندہ نہ رہے تو اس کی انفرادیت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ سب کی موجودگی میں اپنے آپ کو الگ رکھنے کا نام انفرادیت ہے۔ اسے جب یہ خیال ہوا تو اسے اپنے پاؤں سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ انہی سے ہی چل کر اس نے لوگوں کو جنگ کے لئے اکسایا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ ان سے لوگوں کو ایک دوسرے کی گردنیں دبانے کا طریقہ اس نے سکھایا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں سے نفرت ہو گئی کیونکہ انہوں نے لوگوں کو قتل ہوتے دیکھ کر بھی اپنے آپ کو پلٹا نہ تھا۔ اسے اپنے کانوں سے نفرت ہو گئی کیونکہ انہیں چیخیں سننے کا شوق ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو ہاتھ پاؤں، آنکھوں اور کانوں سے الگ کرنا چاہا مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں بلکہ ان چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے حرکت ہی سے وہ زندہ ہے اس لئے اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے دنیا کو آپس میں لڑانے کے بجائے دنیا سے خود لڑے گا کیونکہ اس طرح اس کی انفرادیت کی جنگ چلتی رہے گی اور لوگوں کا قتل بھی نہ ہو گا۔

ہاتھوں میں اس کے ہاتھ بھی قائم رہیں
پاؤں میں اس کے پاؤں بھی قائم رہیں
لفظوں میں اس کے لفظ بھی قائم رہیں
یہی انفرادیت ہے، یہی کمتی ہے

بکھرے لفظ

اُداس دل سے نکلے ہوئے لفظ صبح کے تارے کی مانند ہواؤں میں
لپٹے ہوئے ظلمتوں میں گم ہو گئے اور ہوا کے بدن کو ان کی بناوٹ نے ایسا نوچا
کہ غبار سے تو زمین کے اندر گھس گئے۔ لیکن بھوتوں کے ہاتھ اُڑ کر خلاء سے
ایسے ٹکرائے کہ زمین کے ذرے چیخ کر کہنے لگے کہ دشمن آسمان سے ہے ستاروں
سے نہیں۔ اور پھر زندگی کے ساز کا ربط ٹوٹ گیا۔ یوں لگا کہ وہ بانسری
جو جنگلوں کی شہزادی شہروں میں سجایا کرتی تھی اسکی آواز کو درختوں

کے پتوں نے پی لیا ہے۔

معصوم ٹہنیاں صرف اس لئے سہم گئی ہیں، کہ چلنے والے مسافروں کو پھول توڑنے کا شوق اگر ہوتا تو انہیں توڑ کر سونگھتے ضرور لیکن تباہی تو ان کے خون میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب انھوں نے سورج کے مقابلے ایک اور سورج بنانے کا منصوبہ بنایا تھا، حالانکہ بہتے ہوئے پانیوں سے ٹھہرے ہوئے سمندروں کے بچوں سے یہ بھی کہا تھا کہ سورج کئی گنا زمین سے بڑا ہے۔

نروان کی تلاش کرتے کرتے ایسے برف میں ڈھکے ہوئے انسانی بدن ملے، جو اندر کی آگ سے جلے ضرور مگر باہر کی ٹھنڈک نے انھیں راکھ نہ بننے دیا۔ جیون کے تیاگ کے بعد جیون کا نروان ڈھونڈنے والے کی آنکھوں سے ہوا کے ایسے پتھر نمودار ہوئے جو جب پانیوں کے قلعے پر برسے تو ساری زمین پر ایسا قحط پڑا کہ سمندروں نے پانی پی کر درختوں کے پتوں میں ان لفظوں کو لپیٹنے کی کوشش کی جو آدم نے سب سے پہلے ہوا کو کہے تھے، پھر کائنات کا ظہور کسی کی خواہش تو نہیں یا کسی کا اختیار نہیں۔

اے انسانو: کانوں کو کٹوا کر سن لو

اے درختو: اپنے جسموں سے چھالیں اُتروا کر سن لو

اے پتھرو: ان لفظوں کو اپنے اوپر اچھی طرح کھود لو۔

کہ کائنات کا ظہور بالکل نہیں ہوا بلکہ یہ قایم و دائم ہے۔

اندھی لکیریں

نظر کی وسعت اس قدر تنگ ہوئی کہ ایک لفظ ایسا بکھرا کہ عام فلسفے اپنے اندر جذب کر کے معصوم "بچے" سے پُوچھنے لگا۔ "تمہارے اُس خواب کا کیا ہوا، جس میں تم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ تم پہاڑی پر چڑھ کر اپنی اُنگلی کو آسمان سے چھو لو گے"؟

اور پھر آواز اتنی تیزی سے پھیلی کہ ہوا کے جسم پر

لکیروں نے اپنے وجود کو محسوس کرتے ہوئے نامعلوم دریاؤں کے پانیوں کو یہ سرگوشیاں کرتے ہوئے سنا کہ آخر سمندر کا وجود تو ان کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اور جو لوگ دریاؤں کو سمندر میں گرنے کا فلسفہ لکھتے ہیں۔ وہ یہ بات لکھ کر کھڑکیوں پر کیوں نہیں لگاتے کہ سمندر میں دریا کا قتل ہوتا ہے اور پانی کا وجود بنتا ہے۔ پانیوں کے خشک جزیرے اور ریگستانوں کے اندر بستے ہوئے سمندر میں بوجھ کے سوالوں کا جواب ہے جس کا سندور منگل ستارے کے گرد چکر لگانے والی الیبسر انے چرا کر سورج کے بیٹے کو خوش کرنے کے لئے چاند کی خوبصورت بیٹی کی آنکھوں میں صرف اس لئے ڈالا تھا کہ وہ اندھی ہو کر خلا کے شیشے میں اپنے وہ ہاتھ نہ دیکھ سکے جو اتنے خوبصورت ہیں کہ ستارے بھی انہیں دیکھ کر کالے ہو جاتے ہیں۔

بات نے لفظوں کو پی لیا۔ ریت کے پہاڑ دیکھ کر معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر چیز ان کی حقیقت ہے۔ ملے ہی چیزوں کو بٹتے اور مٹاتے ہیں۔ دلوں کو جب اس نے دبانا چاہا تو ہوا کے جسم پر پڑی لکیروں نے چیخ کر کہا۔

اے صدی میں نے دن کو دن سے جوڑ کر تمہارا وجود بنایا ہے ورنہ تمہاری حقیقت تو کچھ بھی نہیں۔ سورج بن کے پجاری آخرکار اندھے ہو گئے اور آواز کے پنچھیوں نے گونگے ہونے سے پہلے لفظوں کو حرفوں میں بانٹ دیا۔

پھر جوان ماں نے اپنے بڑھے بیٹے سے صرف اتنا پوچھا۔

"تمہاری اس انگلی کا کیا ہوا جو تم نے آسمان کے بچھونے کیلئے اپنے ہاتھ سے الگ رکھی تھی"

"سڑک سے بھول دشمنی مت لو" الف نے کنکر توڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے پاؤں تو اس نے زخمی کر دئیے ہیں اور اس قدر بے وفا ہو گئی ہے کہ اب مجھے موڑ کاٹنے پڑتے ہیں اور یہ قائم و دائم رہتی ہے"

ب نے ریت کا گولہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

ایک دن چاند کو سرِ بازار کھڑا کر کے پھانسی دی جائے گی اور مم کہتا ہے پھر بچوں کو ایسے کھیل کھیلنے کی پوری آزادی ہو گی۔ کیونکہ

چاند رات کو تو چاندنی دیتا ہے مگر دن بھر سورج کو ہماری کہانیاں
سناتا رہتا ہے اور اگر ہم اپنے کھیل جاری رکھیں گے تو یہ تمام باتیں
سورج کو سنا دے گا اور سورج ہم کو اندھا کر دے گا کیونکہ سورج
جلتا روشن ہے دل کالا اتنا ہی کالا ہے اور جتنے بھی کالے پتھر دھرتی
پر ہیں وہ تمام سورج کے دل کے ٹکڑے ہیں۔

بچے کی سوچ ابھی کھڑکی سے باہر نکلی ہی تھی کہ لفظوں کے
بیوپاری نے اُسے قید کر لیا۔

سڑک بے لحاظ سے ٹھگ۔ بچھانے والوں کے ہاتھوں سے
نفرت کرتی ہے۔ بالکل اُس اندھیر نگری کے راجہ کی طرح ہے جو کانوں
کے جرم کی سزا آنکھوں کو دیتا ہے اور پاؤں اگر غلطی کریں تو ہاتھ کٹوا
دیتا ہے یہی بات ہے کہ اس نگری کے تمام لوگ بے قصور ہیں۔ مگر انھوں نے
نے جرم بھی کیا ہے۔

بس پھر کیا تھا دھوپ تیز نکل آئی۔ دھوپ یہی دھوپ ہے
جب جی میں آیا نکل آتی ہے اور جب جی میں آئے چھپ جاتی ہے۔ کہتے
ہیں کہ سورج کی روشنی دھوپ میں جہاں تبدیل ہوتی ہے وہیں پر بچوں
کے وہ خواب بستے ہیں جن میں انھوں نے اپنی عمر سے زیادہ بڑی عورتوں
سے پیار کرنے کی خواہش کی تھی اور سچ یہ بھی ہے کہ ستاروں کو آسمان
پر ٹانکنے سے پہلے آسمانی حوروں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ لوگ مرنے کے
بعد ہم سے بھوگ کیسے کر پائیں گے جو جیون میں ہی اپنی بیویوں کو تیاگ

چکے ہیں۔

ب نے ریت کا گولہ پھینک دیا۔ "ارے بھائی دیکھو یہ تو بکھر گیا ہے۔" الف نے کہا۔ "آخر ریت کا گولہ تھا اسے ضرور بکھرنا تھا۔" ب نے جواب دیا۔ "مگر تم نے تو اسے بڑا مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی۔" "وہ ریت کا گولہ آخر ریت کا ہی ہوتا ہے چاہے اسے کتنا ہی مضبوط کیوں نہ بنایا جائے۔"

دراصل زندگی کے رنگ ہی اسکی بے رنگی کی وجہ ہیں۔ جو لوگ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر گئے تھے انھوں نے یہ وصیت کی کہ انھیں اتنی ہی گہری کھائیوں میں زندہ دفنایا جائے۔ "مگر کیوں"۔ سوال پوچھنے والا اپنی عادت کے مطابق پوچھتا رہا۔

جواب دینے والے کی آنکھوں سے وہ خواب جھانک رہے تھے، جو اس نے جاگتے ہوئے دیکھے تھے۔ "کیا انسان جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھتا ہے اور وہ خواب کس قسم کے ہوتے ہیں۔" الف نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"بس یہی کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر اس کی حقیقت تب کھلتی ہے جب ہر شخص کو اس کا اپنا درد خود محسوس کرنا پڑتا ہے۔" ب نے جواب دیا۔

"تو اسکے بعد تم یہ بھی کہو گے کہ سڑک کے زخم ہمیں ضرور محسوس کرنے پڑیں گے۔" "یہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسا ہر حال

ہیں ہوتا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

انھوں نے اعلان کیا کہ اب وہ سڑک پر نہیں چلیں گے۔ تمام رشتے اب ٹوٹیں گے۔ تعلق قائم و دائم رہیں گے۔ وہ اب کسی کے غلام نہیں ہیں۔

"ارے بھاگو، بھاگو۔ یہ سڑک ہمارے پاؤں لیکر بھاگ رہی ہے۔" اُن دونوں نے کہا۔

وہ آپس میں لڑنے کا سبب نہیں جانتے۔ البتہ یوں ہوا کہ ایک خوفناک لڑائی لڑی گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کے بچوں کو قتل کیا۔ درخت اکھاڑ ڈالے۔ جنگلوں کو آگ سے جلا دیا۔ پھر آگے بڑھے۔ دھرتی کو روندھ کر انھوں نے ایک دوسرے کے گھر پر قبضہ کر لیا اور پھر فتح کا جشن منانے کا اعلان کیا۔

وہ دونوں اپنی جیت پہ بہت خوش تھے مگر انھیں اپنے گھروں کی فکر

تبھی نہ تھیں۔

انھیں یاد آیا کہ جب انھوں نے اپنے گھروں کو چھوڑا تھا تو انگنوں نے التجا کی تھی کہ بچوں کا قتل نہ کرنا۔ پھولوں نے خوشبو بکھیر کر کہا تھا کہ ہر عورت کے دل میں رنگ برنگی ساڑھیاں پہننے کی خواہش ہوتی ہے۔ دروازوں نے ظاہر کیا تھا کہ وہ اُن کا انتظار کرتے رہیں گے۔ بشرطِ صرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کی کھڑکیاں نہ توڑیں۔

مگر انھوں نے وہ سب کچھ کیا جسکے متعلق وہ جانتے ہیں کہ انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر تمام باتوں کا ایک ہی جواب تھا کہ آخر کار تو وہ جیت گئے ہیں۔ مگر انھوں نے گھروں کو کیوں چھوڑا۔ اس بات کا جواب اُنکے پاس نہیں ہے۔ بس اپنے بچوں کی خواہشیں، بیویوں کی آرزوئیں لیکر وہ روانہ ہوئے تھے۔

موسم آتے اور جاتے رہے، دن گزرتے رہے۔ تھکن اُن کا مقدر بن گئی۔ انھیں فکر ہو گیا کہ اگر جیتے ہوئے گھروں کو چھوڑ جاتے ہیں تو دوسرے اُن پر دوبارہ قبضہ کر لیں گے۔ اپنی جیت کو وہ کسی طرح بھی کھونا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جیت کر وہ خوش نہیں ہے۔ وہ قیدی بن گئے۔ جسے وہ آزادی سمجھتے تھے وہی اُن کی قید کی وجہ بن گئی وہ سوچنے لگے کہ یہ لڑائی فضول لڑی گئی۔

وہ مجبور ہو گئے۔ بے بس ہونے کے باوجود وہ نیند کے لئے ایک لمحے کو ترس گئے۔ مگر اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے وہ ایک ہی اعلان کرتے

"ہم جیت گئے ہیں"، مگر یہ آواز بھی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اِس لئے اُن کے اپنے ہی کانوں کو یہ چیخیں بھی سُننا پڑتیں۔ اس ایک لفظ جسے جیت کہتے ہیں کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بے شمار لفظوں کو قربان کیا۔ رحم پیار، وفا اور محبت جیسے لفظوں کو کھویا، اُن کا قتل کیا، خون کے دھبوں سے ان لفظوں کو سیاہ کیا۔

ماں کا بچے سے پیار۔ اس پیار میں وہ درد چھپا ہے جو ماں کو بچہ جنتے وقت ہوتا ہے۔ راتوں کے جگراتوں کی کہانی، خود بھوکا رہ کر بچوں کو کھلانے کی داستان۔ ان سب کا حاصل ایک ہی لفظ ہے پیار۔

انھوں نے یاد کیا کہ بے شمار کہانیوں کو انھوں نے قتل کیا۔ لامحدود خواہشوں کو انھوں نے روندا، آنکھوں نے تڑپ کھوئی، کانوں نے چیخیں سُنیں پھر انھیں ایک لفظ ملا جیت۔ مگر بہت بدقسمت تھے وہ کہ انھیں اپنی ہار کا پتہ نہ لگ سکا۔ دوسروں کے گھر تو انھیں مِل گئے مگر اُن کے اپنے گھر کھو گئے۔

بس یہی زندگی ہے جسے آدمی جیت سمجھتا ہے وہ اُس کی ہار بھی ہوتی ہے۔ جب آدمی ایک سمت سے آگے بڑھتا ہے تو خوش ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھا ہے کہ دوسری سمت سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

آخر ایک دن ہواؤں کو انھوں نے قریب سے محسوس کیا اور یہ بھی جان لیا کہ پتھر کے ذروں کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ انھیں یاد آیا کہ ان کے اپنے گھر بھی تھے، جن کے دروازے اُن کے انتظار میں کھلے رہتے

تھے اور جن کے آنگنوں میں اُن کے ننّھے بچّوں کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

پھر وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ اُنھیں اپنی جیت پر غصّہ آیا۔ انھوں نے سوچا کہ اپنے گھر جانے سے پہلے کیوں نہ دوسرے کے گھر کو برباد کیا جائے تاکہ جیتا ہوا گھر اُسے واپس نہ مل سکے۔ بس یہی سوچ کر ایک دوسرے کا گھر برباد کر کے وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

وہ بہت خوش ہیں کیونکہ وہ اپنے گھر کی طرف، دشمن کا گھر برباد کر کے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے بچّوں کو دوسروں کے بچّوں کو قتل کرنے کے بعد مل رہے ہیں۔

کتنے ظالم ہیں وہ

کتنے معصوم ہیں وہ

زاویے

ہر لکیر ایک زاویہ بناتی ہے اور یہ زاویہ لکیر کے شروع ہونے
اور ختم ہونے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ زندگی بھی ایک سیدھی لکیر ہے
جس کی کہانی ان دیکھے اِن کھنچے زاویوں میں گرفتار رہتی ہے کوئی بھی
بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ زاویہ بنتا ہے۔ زندگی کا زاویہ جس کی
اپنی ہی ایک ڈگری ہوتی ہے اور پھر سچ تو یہ ہے کہ زاویے کی لکیر کو
جتنا مرضی آگے لے جاؤ، اس کی ڈگری میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو ظاہر

یہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص کی اپنی ایک ڈگری ہے اس لئے بہتر ہے کہ پاپ اور پوپ کے فلسفوں کو جلا دیا جائے اور فرشتوں کو کاندھوں پر سے آزاد کر دیا جائے کیونکہ ان کے بچے بھی ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

اور پھر سچ تو یہ بھی ہے کہ سورج شروع سے سفر کے ساتھ ہے اور اس کی کرنیں دھرتی پر روشنی نہیں بھیجتی بلکہ زاویے بناتی ہیں اور انہی زاویوں کی وجہ سے ہوا چہروں کو چوس لیتی ہے، خوبصورت چہروں کو۔

آخر کار ہر لکیر کو کہیں نہ کہیں ختم بھی تو ہونا ہے۔ چاہے کتنی بھی لمبی کیوں نہ ہو" تو تم صاف صاف کہہ دو کہ ہم میں سے ہر شخص چونکہ شروع ہوا ہے۔ اس لئے ختم بھی ہو جائے گا،" اس نے یہ کہا ہی تھا کہ شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ پندرہ برس کی لڑکیاں اپنی کتابوں میں سوکھے ہوئے پھول رکھتی ہیں۔ لہذا لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ کوئی بھی لڑنا نہیں چاہتا مگر جنگ پھر بھی جاری ہے۔ اپنے ہاتھ جلانے کے بعد بھی لوگوں میں آگ لگانے کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ ہمارے ہاتھ اگر دوسروں کے گھر جلانے میں مصروف ہیں تو دوسروں کے ہاتھ ہمارے گھر جلانے میں مصروف ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود آگ لگانے کا سلسلہ جاری ہے۔

دو میلوں سفر طے کرنے کے باوجود ہمارا درمیانی فاصلہ ایک

اینچ بھی کم نہیں ہوا" متوازی لکیروں نے کہا اور رو پڑیں۔

"سلسلوں کی جنگ حاصل صرف حادثے ہیں" وقت کے سینے میں یہ سطریں پیوست تو ہوگیئں مگر اپنا مطلب کھو بیٹھیں۔

میرے سفر کے ساتھ میری آنکھوں نے اپنا ایک الگ سفر بھی جاری رکھا۔ میں کہیں رک جاتا تو یہ چل پڑتیں۔ میں کسی کو پسند کرتا تو یہ دیکھنا بھی گوارا نہ کرتیں۔ یہی بات ہے میں آج تک یہ تہا ہی نہ کر سکا۔ کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا پسند نہیں اور نہ ہی میں اپنی خواہشوں کا اظہار کر سکا اور اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ جو کہانیاں نمودار ہوئیں، انہیں میں بیان نہ کر سکا اور جو بیان ہوئیں وہ میری اپنی کہانیاں نہیں تھیں۔ میں اگر تھک گیا تو پاؤں نے رکنے سے انکار کر دیا اور اگر میں نے دوڑ کر اپنے سائے کو پکڑنا چاہا تو پاؤں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ موسموں سے لڑنے کے علاوہ میں اپنے جسم سے بھی لڑتا رہا۔

آنکھوں کے الگ سفر کی وجہ سے میرا ان پر کنٹرول نہیں رہا۔ اب میں زاویے تو ٹھیک بناتا ہوں مگر لکیریں بہت لمبی کھینچ دیتا ہوں اور اسی جرم کی سزا کے طور پر میں نے اپنے آپ کو قید کرنے کا حکم دیا ہے۔ اپنے آپ پر یہ سنگین جرم عائد کرنے سے پہلے میں نے قانون کی سب سے بوسیدہ کتاب سے پوچھا، کہیں میں اپنے ساتھ بے انصافی تو نہیں کر رہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ کتاب بھی زندگی کی طرح لفظوں کا قید خانہ ہے۔ جس طرح زندگی اپنے اندر مہینوں، برسوں و دلوں کو قید

کر کے رکھتی ہے۔ اسی طرح کتاب نے بھی خوبصورت لفظ و سطریں قید کی ہیں۔ یہی بات ہے کہ زندگی کے مہینوں کو موسم نصیب نہیں ہوتے ہیں۔ کاش کہ ہم میں سے ہر آدمی زندگی کے برس الگ الگ کر کے جیتا اور ہم گنتی کا حصّہ نہ ہوتے۔ میں نے موسموں پر بے وفائی کا الزام لگایا مگر اس بات کو میں بھول گیا کہ میں نے انھیں مہینے ہی بک دیا ہے اور میں نے ہی انہیں مہینوں اور برسوں میں دفن کیا اور میں آج جہاں بھی ہوں حادثے کی وجہ سے ہوں۔ کتابوں کے ڈھیر پڑھنے کے باوجود میرا ذہن مطمئن نہیں ہے۔

زاویہ جب تک نامکمّل ہے اس کی کوئی ڈگری ہے اور ڈگری دوسری پر حق جتا کر ہمیشہ جھگڑے پیدا کرتی ہے اور زاویہ جب مکمّل ہوتا ہے تو پھر دائرہ بناتا ہے اور دائرے کی ڈگری صفر ہے یعنی ہر چیز جب مکمل ہوتی ہے تو مر جاتی ہے۔

آخر ایک دن لکیروں نے کہا وہ سیدھی چلیں گیں اور کوئی زاویہ نہیں بنائیں گی۔ انہوں نے سیدھا چلنا شروع کر دیا۔ چلتی رہیں دوڑتی رہیں اور پھر اپنی ہی رفتار کی وجہ سے ٹیڑھی میڑھی ہو کر زاویے بنانے لگیں اور ہر زاویے کو ایک دن مکمّل ہونا ہوتا ہے۔

غم

اُس کی چیخوں کا سبب لوگ نہیں جان سکے۔ "کیا تمہیں جسم
کے کسی حصّے میں درد ہے۔" مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "کیا تم
بیمار ہو؟" "ارے دیکھو میں بھی بیمار ہوں۔" بیمار آدمی نے اُس سے کہا۔
مگر وہ چیختا ہی رہا۔ "تمہیں بھوک لگی ہے؟" بھوکے شخص سے پوچھا
"تمہارا بچّہ تو نہیں کھو گیا۔" جس آدمی کا بچّہ کھو گیا تھا اُس نے سوال
کیا۔ "کیا تمہاری بیوی بھاگ گئی ہے؟" یہ سوال اُس نے کیا جس کی

بیوی بھاگ گئی تھی۔ مگر وہ شخص لگاتار چیختا ہی گیا۔ اس نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ لوگ حیران ہو گئے۔ اور سامنے والے پہاڑ کے متعلق سوچنے لگے اور سوچتے ہی گئے۔ انھوں نے اپنے بچوں کے اس سوال کو جواب دینے کے بجائے کہ بچپن میں ہی انھیں ماں سے الگ کیوں سونے کے لئے کہا جاتا ہے، یہ محسوس کیا کہ اس پہاڑ نے آسمان کو اٹھایا ہوا ہے لہذا اسے پوجا جائے۔

اس کے بعد بستی کے لوگوں نے اُسے پہاڑ کو پوجنا شروع کر دیا۔ لوگ ہر روز صبح اٹھتے اس پہاڑ کو سجدہ کرتے۔ بچوں نے صبح ماں، باپ کے بجائے اس پہاڑ کے آگے سر جھکانا شروع کر دیا۔ کنواری لڑکیاں اپنی جوانی کے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے اس پہاڑ کے آگے منتیں مانتیں۔

لوگوں نے سوچا یہ پہاڑ انھیں پاپوں سے مکت کرائے گا۔ انھیں احساس ہو گیا ہے کہ وہ پاپوں سے بچ نہیں سکتے۔ کیونکہ پاپ تو شروع ہی سے ان کے خون کے اندر رچے تھے۔ خوبصورت چہروں کو دیکھنے کے لئے عمر کے آخری لمحے بھی ترستے رہتے ہیں اور وہ دیواریں جو انھوں نے جھگڑے مٹانے کے لئے دھرتی پر بنائی تھیں۔ ان کے پتھروں سے ہی انھوں نے ایک دوسرے کے سر پھوڑے۔ لوگوں نے چشموں کو منہ میں بند کرنے کی کوشش کی۔ مگر پیاس پھر بھی بڑھتی ہی گئی۔

اب انھوں نے سُکھ کا سانس لیا ہے، اب وہ بھوگ کرتے ہیں، سُکھ بھوگتے ہیں، تیاگ، کو انھوں نے تیاگ دیا۔ کہیں کوئی جھگڑا نہیں، کوئی لڑائی نہیں۔ ہر آدمی اپنا سُکھ بھوگنے میں مصروف ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس اپنا ہی اتنا سُکھ ہے کہ اگر وہ اسے بھوگے تو عمر کم ہے مگر ہم لوگ اپنا سُکھ بھوگنے کے بجائے دوسرے کے سُکھوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

ایک دن عجیب و غریب واقع ہوا۔ اُس پہاڑ سے ایک بہت بڑا سانپ نکل آیا اور پھنکارتا ہوا بستی کی طرف آنے لگا اور آخر کار آہی گیا۔ لوگوں نے کہا کہ پہاڑ کے پوجنے میں کوئی بے ضابطگی ہوئی ہے اس لئے اب قیامت آگئی ہے اور اب ہر ایک کے پُن اور پاپ کا حساب ہوگا۔

یہ سوچ کر تمام لوگ اپنے گھروں کے برتنوں کو سنبھالنے لگے کیونکہ ہر ایک کو شک تھا کہ اُس نے دوسرے کے گھر کا کھانا پکایا ہے، ہر ایک کو وہم تھا کہ اُس نے دوسرے کے کپڑے پہنے ہیں، وہ گھبرا گئے کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ وہ ایک دوسرے کی بیویوں پر نظر رکھتے ہیں۔

"مگر اس اژدہے سے بچا کیسے جائے؟" "ایک طریقہ ہو سکتا ہے" اُن میں سے ایک نے کہا، "ہم اپنے گھروں میں سانپ پالنے شروع کر دیں کیونکہ اس سے اِسکی نسل کو بڑھاوا ملے گا اور اس

سے شاید یہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔" "اگر یہ اپنے کا زہر کو کیا رے گا؟" ہمیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے تو یہ چڑ جائے گا۔

آگ جب بھی چولہے سے باہر آتی تو لوگوں نے اسے اس کے بیلاڈ کی فطرت نہ سمجھ کر اپنے گناہ سمجھا اور اپنی بیٹیوں پر نمک کیا۔

پانی جب بھی دریا سے باہر آیا تو لوگوں نے اپنے جوان بیٹوں کھو کر دیکھا۔

"انہیں سانپ پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ ہم میں سے اتنی لوگوں نے گناہ نہیں کئے ہیں۔" تو کیوں نہ سانپ اس لئے بھی لے جائیں کہ یہ دیوتے ہیں۔"

ہر شخص نے اپنے گھر کے اندر سانپ پالنے شروع کر دئے کہ وہ اژدھا خوش ہو۔

صبح اٹھ کر عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے بجائے سانپوں کو دودھ پلاتیں اور اپنی جوانی کو یاد کرتیں۔ دن بھر انہیں فکر رہتا کہ یہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔ سانپوں کے بچے جوان ہونے لگے اور گھروں کے آنگنوں میں کھیلنے لگے۔ اور اُن کے اپنے بچے سڑکوں پر کھیلنے کی وجہ سے حادثوں کے شکار ہونے لگے۔

وقت بیتتا گیا اور وہ اژدھا بوڑھا ہونے لگا۔ لوگوں

نے سُکھ کا سانس لیا۔ اب قیامت ٹل گئی ہے اب اُنھیں گن ہوا
کا حساب نہیں دینا پڑے گا۔ یہ سوچ کر لوگ پھر اُس پہاڑ کو پوجنے
لگے۔

"اُس پہاڑ کو آسمان بھی چھوتا ہے۔" اُن میں سے ایک
نے کہا "یہ پہاڑ آسمان کو چھوتا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "وہ
سورگ تک پہنچنے کی یہ ایک سیڑھی ہے۔" "اگر آسمان پہ پہنچنا
تو پہلے اِس پہاڑ پہ چڑھنا ہوگا۔" "مگر بیچ میں ایک بہت بڑا
دریا ہے" اُن میں سے ایک نے پھر کہا۔ "تو بہتر یہی ہوگا کہ پہلے سورج
کو پوجا جائے تاکہ تیز دھوپ دریا سوکھا ڈالے۔" بس اُسکے بعد لوگ
سورج کو پوجنے میں مصروف ہوگئے۔

سانپ بڑے ہوگئے اور پھنکارنے لگے۔ اُن کے اپنے گھروں
میں اُن کا رہنا ناممکن ہوگیا۔ سخت دھوپ اور زہریلے سانپ
"قیامت تو اب آئی ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ "لوگ نہ
سانپوں کو مار سکتے ہیں اور نہ اب انہیں پال سکتے ہیں۔"

انھوں نے سمجھ لیا کہ قیامت نے ہر حال میں آنا ہی تھا۔ انھیں
افسوس اِس بات کا ہے کہ انھوں نے سانپوں کو کیوں پالا۔ اپنے
آنگنوں میں بچوں کو کھیلنے کیوں نہیں دیا۔ وہ اژدھے کو خوش کر کے
بھی اِس سے بچ نہ سکتے تھے۔ کیونکہ زہر آخر زہر ہے اور اسے
اپنا اثر ہر حال میں دکھانا ہوتا ہے۔

اب اُنھیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ آدمی اس لئے چیخ رہا ہے
کیونکہ اُسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے اور سچ تو یہ ہے
کہ نہ آسمان پہاڑ پر جھکا ہوا ہے اور نہ پہاڑ آسمان کو چھوتا ہے۔
مگر ہمارا یہ آدمی اس کے چیخنے کی وجہ بیماری سمجھ کر خوش ہے۔
بھوکا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اکیلا ہی بھوکا نہیں ہے اور جس کا بچہ کھو
گیا ہے وہ یہ جان کر خوش ہے کہ ہم نے اور لوگوں نے اپنے بچے بھی
کھوئے ہیں جس کی بیوی بھاگ گئی تھی اُسے تسلی ہے کہ دوسروں
کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔

سراب

وہ ایک بار پھر چیخا "میں ایک ایسا راز جانتا ہوں۔ جسکے اظہار کے بعد خوبصورت لڑکیوں کی چھاتیوں پر ابھار اسی طرح قائم رہیں گے" تمام لوگ اُسکی طرف بھاگے اور عاجزی سے کہنے لگے۔ "ہم تمام رشتوں کو ختم کر دیں گے اگر تم اِس بھید کو کھول دو"۔ یہ سن کر وہ شخص اچانک چپ ہو گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ گویا دیکھ نہ رہا ہو بلکہ سب کچھ اپنے اندر سما رہا ہو۔ ہم سے

ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے اسلئے تو وہ چپ ہو گیا ہے،، دغا
نہیں بلکہ پاپ ہو گیا ہے،، پھر اُن لوگوں نے تمام رشتے ختم کر دیے
گھر چھوڑ کر کھنڈروں میں بسیرے کر لئے اور پھر یہ اعلان کیا کہ
کو گرفتار کیا جائے گا۔ لہٰذا تمام لوگ سفر کی تیاری شروع کر
اپنے ہاتھوں کو ہتھیار سمجھیں اور پاؤں کو اتار کر پھینک دیں تا
میں اُڑ سکیں۔

اِسکی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آواز لفظوں میں کھو گ
ہے اور سورج کی گرفتاری کا خیال اُنھیں اُس وقت آیا جب اُن
کمروں کے دروازوں کے اُن سوراخوں سے دھوپ نے جھانکا
انھوں نے اِس لئے رکھے تھے تاکہ دیکھ سکیں کہ اُن کے بچے کھیل
ہوئے کھلونے نہ توڑ ڈالیں۔ حالانکہ تمام لوگ اُس واقعے کو بھ
جانتے ہیں کہ ایک بار اِسی ڈر سے بستی کے لوگوں نے بچوں کے کھ
چھین لئے تھے۔ مگر بعد میں وہی کھلونے انھوں نے آپسی لڑائی
ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کے لئے استعمال کئے اور یہ لڑائی بچو
کے لئے لڑی گئی تھی۔ بچوں نے یہ چیخ کر کہا تھا تم اپنی دشمنی نکا
کے لئے بچوں کے کھلونے مت استعمال کرو۔ یہ پاپ ہے۔ بچپن کی طرح
کھلونوں کے بھی آپس میں رشتے ہیں، تعلقات ہیں۔ مگر اُن کی کسی نے
نہ سُنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھلونے بھی ٹوٹ گئے تھے اور لوگوں کے سر بھ
زخمی ہوئے اور بچوں کی لعد میں صلح بھی ہو گئی تھی۔ مگر اب سب کو

ہو گیا ہے کہ اُن کے بچوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اُن کے باپ
ماؤں کے جسموں سے لپٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ یہ بھی
گئے ہیں کہ ہر عورت کا جسم ایک ہی طرح کا ہوتا ہے اور رشتوں
اصل میں جسموں کی قید ہے۔

کچھ دیر کے بعد ہوا نے لوگوں سے کہا "تم اگر اپنے جوان
کی بلی دو تو گونگا دیوتا خوش ہو کر وہ منتر انہیں ضرور
دے گا۔ جسے پڑھنے سے سورج ایک چھوٹا سا گولہ بن جاتا
"۔ لہذا جنگوں کا اہتمام کیا گیا۔ اصل وجہ جوانوں کی بلی دینے
۔ مگر اعلان ہوا "دھرم یُدھ میں مرنے والے ہر شخص کو مکتی
۔ اور تمام پاپ نشٹ ہو جائیں گے"۔ لہذا کسی نے بھی
دوسرے کی بیج و پکار نہیں سنی۔ کان ہوتے ہوئے بھی
بہرے اور آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھے ہو گئے۔ سب
پاس بولنے کے لئے زبان تھی مگر کسی نے بھی قتل کے خلاف
احتجاج نہیں کیا۔ قاتلوں کو تو بہادر کہا گیا مگر بیواؤں کو
ستہ آہستہ لوگوں نے رنڈیاں کہنا شروع کر دیا۔ اور پھر
رم یُدھ میں مرنے والوں کے لڑکے بھی اس طرح یتیم ہوئے
طرح ملیریا کی بیماری میں مرنے والوں کے بچے یتیم ہوئے تھے۔
آخر چاند صرف ایک جلتا ہوا دیپک ہے جو آسمان پر رہنے
اور دشتی کی سہاگن دیوہ کے بغیر آنکھوں کے دیکھنے والے شخص

کے سوا گت کے بارے رکھا ہے لیکن سب جانتے ہیں وہ واپس اب لیے نہیں آ سکے گا کیونکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ "آخر ایک دن چاند بھی بجھ جائے گا۔" "لیکن تم نے یہ حقیقت کیسے جان لی ہے" اُن میں سے جاگتے ہوئے شخص نے سوکر پوچھا "دیکھ کر ہر جلنے والی چیز کو ایک دن بجھنا ہے۔" "تو اس کا مطلب ہے اس کے بعد تم یہ بھی کہو گے کہ آخر ہر دیوار کو ایک دن گرنا ہے۔" "کو سمجھ نہیں آتی کہ تم جانتے ہوئے بھی چیزوں کے بارے میں دوسروں سے کیوں سُننا چاہتے ہو" "کیونکہ سُننا کانوں کی عادت ہے اور اگر تم میرے ہونے کے متعلق نہیں سُناؤ گے تو کان کچھ سُننے کے لئے زبان کو چیخنے پر مجبور کر دیں گے۔"

وہ اس بات کی کوشش میں ہیں کہ کس طرح سورج کو ایک ایک چھوٹا سا گولہ بنا کر گرفتار کیا جائے۔ تاکہ دھوپ سے بچا جا سکے لیا جائے اور دن اور رات کا یہ سلسلہ ختم ہو تاکہ وقت نہ بیتے جس کی وجہ سے جوان لڑکیوں کے سینوں پر یہ اُبھار اسی طرح قائم رہیں مگر ایسا ہونا انہیں اس لئے ممکن نظر نہیں آ رہا کیونکہ سورج تک اُن کی پہنچ ناممکن ہے اور پاؤں کٹوانے کے باوجود ہوا نے انہیں اُڑنے نہیں دیا۔

پھر وہ اُس شخص کے پاس چلے گئے اور اُسے کہنے لگے کہ تم وہ بھید کھول دو۔ اُس نے کہا کہ اگر وہ لوگ اُسے کنواری لڑکیاں

کے چہرے پیار سے چومنے دیں تو وہ ایسا ضرور کرے گا۔ لوگوں نے
اُسکی یہ بات بھی مان لی۔ قطاروں میں لڑکیاں اُس کے سامنے آتی
گئیں، وہ انھیں چومتا گیا، تمام لڑکیوں کے چہروں پر نشان بھی پڑتے
دِکھائی دیئے۔ بستی کے لوگوں نے اپنے جوان لڑکوں کو اِن چہروں کی
طرف دیکھنے تک نہ دیا تھا۔ گھوریاپ کہا تھا اِسے۔ اُس نے اعلان
کیا وہ راز سُننے سے پہلے یہ بھی سُن لو" اگر لڑکیوں کی چھاتیوں پر
اُبھار قایم رہیں گے تو جوان بچے اپنے باپوں سے ماؤں کی خاطر لڑائیاں
لڑیں گے"، ورنہ یہ بھید کہ دینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لوگ یہ سُن
کر پریشان ہو گئے، اور چُپ چاپ وہاں سے چلے آئے۔ یہ بات کہہ کر
پھر وہ شخص اچانک خاموش ہو گیا۔

بے بس لوگ

صدیوں سے یہ لوگ چیخ رہے ہیں کہ انہیں رہائی چاہیئے۔ غضب تو اِس بات کا ہے کہ وہ شخص آزادی کا پرچار کر رہا ہے۔ مگر لوگوں کو آزاد کرنے کے لئے اُس کمرے کا دروازہ نہیں کھولتا جس میں وہ لوگ قید ہوئے ہیں۔

"کیا یہاں کوئی بھی میری بات سُننے والا نہیں" وہ چیخا اور پھر خود ہی خاموش ہو گیا۔

کئی بار بولنے اور سُننے کا تعلق آپس میں ٹوٹ جاتا ہے مگر لوگ پھر بھی بولتے رہتے ہیں۔ کبھی بار آدمی دوسروں کو سنانے کے لئے نہیں بولتا۔ بلکہ اپنے آپ پر اپنا وجود ظاہر کرنے کے لئے بولتا ہے تاکہ اُسے یقین ہو جائے کہ اس کا کہیں پر کوئی وجود ہے۔ جسکی اُسے حفاظت کرنی ہے۔

موسم بہت اچھا ہے اور دھوپ بھی تیز ہے۔ اصل بات یوں بھی ہے کہ موسم اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ موسم بس موسم ہے۔ صرف آنکھوں کو دیکھنے کی فرصت ہونی چاہئے۔ جن لوگوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی جیبوں پر تھیں۔ اُنھیں موسم بہت بُرا لگا۔ کیونکہ وہ سردی میں ٹھنڈ، اور گرمی میں جلن محسوس کرتے رہے۔

"ہواؤں کو یہ زخم کہاں سے ملتے ہیں"، اُس نے سوال کیا "ہم جب سانس لیتے ہیں تو ہواؤں پر زخم پیدا ہوتے ہیں" ساتھ کھڑے شخص نے جواب دیا۔

"مگر ایسا کہنے کے بعد تم یہ بھی کہو گے کہ ہمارا وجود دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ ہے"، "یہ کہنے کی ضرورت نہیں اور ایسا کہنا شاید مناسب بھی نہیں۔"

وہ لوگ ایک بار پھر چپ ہو گئے ہیں رہا کر دو۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہے۔ یہ ایک لمبی گلی ہے۔ جسکے دونوں طرف کوئی مکان نہیں ہے۔ جو نہ تنگ ہے اور نہ کھلی ہے۔ کوئی بھی شخص اس پر چلتا نہیں

ہے۔ صرف شور ہی شور ہے۔ لوگ جب بھاگے تو اپنی آوازیں یہیں پر چھوڑ گئے تھے۔ یہ بات تو اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ مگر یہ بات سمجھ نہیں سکا کہ لوگ بھاگے کیوں تھے۔

"لوگ بھاگے کیوں تھے" وہ چیخا۔ مگر یہ کہہ کر اُس نے خود بھاگنا شروع کر دیا۔

یہ بات اُسے بتانے والا کوئی بھی نہیں کہ لوگ اپنے آپ سے بھی آگے نکلنا چاہتے تھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی رفتار تو آواز سے تیز ہو گئی۔ اور وہ بہت پیچھے رہ گئے۔ آوازوں کے بھاگنے سے جو دھول اُڑی، اُس میں یہ تمام لوگ قید ہو گئے۔

بس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں یہ تمام گرفتار ہیں۔ اِن بد نصیبوں کو نہ بارش گیلا کرتی ہے اور دھوپ سکھاتی ہے۔ نازک پھولوں کو چھونے کے بجائے یہ اپنے ناخن بڑھانے میں مصروف ہیں تاکہ ایک دوسرے کے چہرے نوچ سکیں۔

اِن لوگوں کی آپس میں سخت لڑائی ہے کیونکہ جگہ تھوڑی ہے اور آدمی زیادہ ہیں۔

بچے جننے کی خواہشیں اِن کی عورتوں میں ہیں۔ عورتوں کے پیٹ بڑھے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ زیادہ جگہ گھیر رہی ہیں۔

"یہ کمرہ ہے یا جہنم" اُن میں سے ایک نے کہا "مگر ہم رہا کیسے ہو سکتے ہیں" دوسرے نے جواب دیا۔

"ہمارے بزرگوں نے ہماری حفاظت کے لئے جو دیواریں بنائی تھیں وہ قید خانہ بن گیا ہے۔ اور باہر سے دروازہ بھی بند کر دیا گیا ہے تاکہ باہر آکر ہم اپنے گھر کو نہ بھول جائیں" ایک شخص نے سرگوشی کی۔

ان کی حفاظت ہی ان کی قید کی وجہ ہے۔ ان کے بچوں کو ان دیواروں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے جو کہ قید خانے کی وجہ ہیا۔

وہ شخص لگاتار اُن کی رہائی کا پرچار کر رہا ہے۔ ایک دن ایک بچہ دیوار کے ایک سوراخ سے باہر آگیا۔ اُس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا "اکٹھے ہو جاؤ۔ تلواریں اور بندوقیں اٹھاؤ۔ ہمارے گھر پر حملہ ہونے والا ہے"۔

تمام لوگوں نے ہتھیار اٹھا لئے۔ وہ بچہ باہر دروازہ کھٹکھٹاتا ہی رہا۔ پھر رو رو کر زور زور سے کہنے لگا "ابا۔ ابا۔ دروازہ کھولو" مگر اتنا شور ہے کہ کوئی بھی شخص اُس بچے کی آواز سن نہیں سکتا۔

ایک عورت نے چیخ کر کہا "میرا بچہ اس سوراخ سے باہر چلا گیا ہے"۔ "اُسے ڈھونڈنا فضول ہے۔ مگر اس سوراخ کو بند کر دو تاکہ کم از کم باقی آدمی تو باہر نہ جا سکیں"۔ دوسرے شخص نے جواب دیا۔

وہ بچہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور وہ شخص اُس کے قریب کھڑا زور زور سے چیخ رہا ہے۔ ان لوگوں کو رہائی چاہیئے۔

اور وہ اس دور کا پیغمبر ہے کیونکہ آواز بلند کر رہا ہے اور یہ دور آواز بلند کرنے والوں کا ہے۔ اور کمرے کے اندر لوگ دعا کر رہے ہیں "کاش ہمیں بھی آزادی مل جائے۔"

الفاظ

"وہ ہوائیں کبھی واپس نہیں آئیں گی جو ہماری زندگی کے خوبصورت
لمحوں کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں" الف نے کہا "مجھے تو اس بات کی
سمجھ نہیں آتی کہ ہوا کیوں آخریت کے پہاڑوں کو بنا کر بکھیرتی ہے"
مگر اس کی آواز کسی نے نہ سنی اور اس کی آواز سننے بھی کون؟
کیونکہ اس کے ساتھ کے تمام حرف تو اب الفاظ میں قید ہو چکے ہیں۔
اور الف کی انفرادیت بھی ختم ہو گئی ہے کیونکہ یہ ہر حرف کے اندر

ہوتے ہوئے بھی اپنا ایک الگ وجود رکھتا تھا۔ اور اب الفاظ میں مدغم ہو کر یہ فقروں کا حصہ بن گیا ہے۔ اور فقروں کا صرف مطلب ہوتا ہے آواز نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر فلسفے، ہر کتاب کا صرف مطلب ہے آواز نہیں۔ یہی بات ہے کہ کتابوں کے ڈھیر بھی بے اثر گئے۔ اور انسان مطلب تو سمجھ گیا مگر اپنی آواز نہ سن سکا۔

"اور تمام جنگوں کی اصل وجہ الفاظ ہیں،" ج نے کہا "جو اپنے وجود کی خاطر امن اور بھائی چارے کے فلسفوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور انسان امن کے پرچار کی خاطر ہی جنگ لڑتا ہے،" اس نے یہ کہا ہی تھا کہ اس کے نقطے کو لفظ نے اپنے ساتھ ملا لیا اور آواز ہوا نے اپنے اندر جذب کر لی۔

اور واپس آنے والے لوگ ایک دوسرے سے شرمندہ تھے کیونکہ سب نے ایک دوسرے کو دھوکا دیا تھا۔ جسے وہ اپنی جیت سمجھتے تھے وہی ان کی ہار نکلی، کیونکہ جتنا وہ آگے بڑھے، اتنا ہی اپنی دھرتی سے پیچھے رہ گئے۔ اور یہ سب کو بعد میں معلوم ہوا کہ دھرتی بس دھرتی ہے اور لوگ بس لوگ۔

"تو سب سے پہلے ہمیں الف کی رہائی کی کوشش کرنی چاہیے" حرفوں نے سرگوشیاں کیں۔ مسافروں نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ ان کے سفر کا مقصد کیا تھا۔ مگر ہر ایک نے اتنا ضرور کہا کہ آنکھیں ایک دوسرے کی رفتار دیکھنے میں مصروف رہیں۔ اسلئے

کسی کو بھی اُسکے اپنے زخم دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی،
ہم نے ایک دوسرے کی گالیاں تو ضرور سُنیں مگر اپنی
آواز نہ سُن سکے،

طوفان تھم گیا، مگر پھر بھی لوگ دوڑنے میں مصروف
رہے۔ اِن کے سانس پھول گئے، جسم لہولہان ہو گئے، ہر ایک
نے محسوس کیا کہ مصیبت اسی کے پیچھے ہے۔ مگر اصل میں ایک
دائرہ تھا اور سب ایک دوسرے کے پیچھے تھے،

"مگر ایسا کرنے سے پہلے ہمیں اپنے وجود کو مٹانا ہوگا،"
الفاظ نے یہ سوچا ہی تھا کہ وقت کے جھونکے نے کتاب زور سے
بند کر دی اور یہ اعلان ہوا کہ کتاب کے خلاف بولنے والوں کی
زبان کاٹ دی جائے گی،

چیخ

سورج کے سامنے کھڑے ہو کر اُس شخص نے پیچھے نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سمتوں میں بٹا ہوا یہ سفر اُس کی آنکھوں کو دھوکہ دے رہا ہے اور اُسکے کانوں نے پھر وہی لفظ سُننے کے لئے کہا جنہیں زبان نے بولنے سے انکار کر دیا تھا

بات پرانی بھی ہے اور نئی بھی۔ پرانی اس لئے کہ صدیوں سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور نئی اس لئے کہ ہر روز ہو رہی ہے اُسے صرف

چیخ

سورج کے سامنے کھڑے ہو کر اُس شخص نے پیچھے نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سمتوں میں بٹا ہوا یہ سفر اُس کی آنکھوں کو دھوکہ دے رہا ہے اور اُس کے کانوں نے پھر وہی لفظ سُننے کے لئے کہا جنہیں زبان نے بولنے سے انکار کر دیا تھا۔

بات پرانی بھی ہے اور نئی بھی۔ پرانی اس لئے کہ صدیوں سے ہوتی

چلی آرہی ہے اور تنگ اس لئے کہ ہر دن ہو رہا ہے اُسے صرف آتنا کہا گیا تھا کہ وہ یہ کہے کہ اُس کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اُس نے سب کچھ جان لیا ہے۔

مگر وہ اپنی کہی ہوئی بات کو غلط کہنے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ اُسے شک تھا کہ اس کے بعد اُس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ وہ اپنے اُن گناہوں کا اعتراف بھی کرے جو اُس نے انجانے میں کئے تھے۔

اُس وقت اُس کے لئے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا بھی ناممکن تھا کیونکہ وہ اپنی پاکبازی کا سبق بچوں کو پڑھا چکا تھا اور بچے یقین بھی کر چکے تھے، اس نے اعلان کیا بچوں کو یقین کرانے کے لئے جو بھی جھوٹ بولا جائے گا، وہ پاپ نہیں سمجھا جائے گا۔

اُسے جب پتھر کے مہاراج کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ چپ رہا۔ پتھر کے مہاراج بات سُنتے نہیں، صرف کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ دیواروں کے کان نہیں ہوتے بلکہ آنکھیں ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود اُسے اس بات پر یقین ہے کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ اُسے کئی انہونی باتوں پر بھی یقین کرنا پڑتا ہے۔ اُسے اس بات پر بھی یقین کرنا ہے کہ اُس کے بیٹے کی دُلہن کی کوئی خواہش نہیں، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

پتھر کے مہاراج نے بغیر سُنے ہوئے اُس پر سزا دی کہ وہ ٹھوکریں کھائے گا۔ یہ سُن کر وہ بڑا خوش ہوا، اُس نے سوچا کہ یہ سزا

کبھی بھی طور اُس پر حاوی نہیں ہو گی کیونکہ ٹھوکریں تو پاؤں نے کھائی ہیں اور اُسکے پاس دیکھنے کے لئے آنکھیں ہیں۔

سِتم تو یہ ہوا کہ اُس کے پاؤں اور اُس کی آنکھوں کے درمیان رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ اُس کی آنکھیں جہاں سیدھا راستہ دیکھتیں، پاؤں وہیں پر رک جاتے اور جہاں یہ گڑھے دیکھتیں، پاؤں چلنا شروع کر دیتے۔

اُس کا وجود پاؤں اور آنکھوں کے اِس تضاد میں بٹ کر رہ گیا۔ اور وہ اپنے اوپر ہونے والے کسی بھی ظلم کے خلاف احتجاج نہ کر سکے۔ اور شاید وہ اُس وقت تھا جب اُس نے سب کچھ سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی آنکھوں نے چاہا کہ ستاروں اور سیاروں کو اپنے اندر جذب کر لیں۔ ہاتھوں نے تمام کائنات کو دبوچنا چاہا اور پاؤں نے ایک ہی چھلانگ میں آسمان کو سر کرنے کی کوشش کی۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ اگر آنکھیں سب کچھ اپنے اندر دبوچ لیتی ہیں تو ہاتھ کائنات کو پکڑ نہیں سکتے اور اگر ہاتھ ایسا کر بھی لیں تو پاؤں آسمان کو سر نہیں کر سکتے۔

اسی لئے آنکھیں ہونے کے باوجود اُس نے ٹھوکریں کھائیں اور لہولہان بھی ہو گیا۔

اُسے یاد آیا کہ اُس کے پیدا ہوتے ہی خواہشیں اور آرزوئیں بھی پیدا ہوئی تھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ پودا درخت بنتے بنتے

بڑھتا رہتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا ہو رہا ہے مگر اصل میں وہ بٹ
رہا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بٹتا رہا۔ پہلے وہ تھا پھر بیٹا
بنا، پھر بھائی، پھر چچا، پھر باپ۔ ایک وہ اور اتنے نام، اسنے
تعلق وہ کیسے نبھاتا۔

بس سفر تھا۔ سمتیں تھیں اور وہ تھا، مگر بٹا ہوا۔ اس کی آنکھیں
اگر ماں کی طرف دیکھتیں تو کان بہن کی آواز سنتے۔ اور بدن بیوی کی
خواہش کے لئے چل رہا ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اسے چلنا تھا سب
سے آگے نکلنا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی الجھ گیا۔ گھبراہٹ اس کا مقدر
بن گئی۔ جو آرزوں کی اسے دبایا تھا، وہ بغاوت پہ آمادہ ہوئی
اور چیخ کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ وہ یوں چیخا "میرا سفر مجھ سے واپس
لے لو۔ مجھ کسی سے بھی آگے نہیں نکلنا ہے۔ مجھے درخت کی چھاؤں
تلے بیٹھ کر ایک گھونٹ پانی پی لینے دو۔ میں اب کبھی بھی سمندر کی
خواہش نہیں کروں گا۔" مگر اس کی یہ آواز سنتے کون، وہ تو اپنے
آپ سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ اور اتنا آگے نکل چکا تھا کہ اس
کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔

پاڑوسی

کوئی ہر روز میری زندگی کے دھاگے کو گانٹھ مار دیتا ہے۔ گو اس
جود تو اُتنا ہی رہتا ہے مگر دھاگہ لمبائی میں کم ہو جاتا ہے۔ میں ازل
اُس شخص کی تلاش میں ہوں، کیونکہ میں اُسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایسا
ے کے لئے میں نے اپنے ناخن بڑھا رکھے ہیں، ہر روز جس جگہ کونپلیں پھوٹتی
ور خوبصورت حسین اور، پر اُبھار نمودار ہونے ہی لگتے ہیں وہ گانٹھ مار کر

میری عمر کی لمبائی کو کم کر دیتا ہے۔

مجھے اپنے پڑوسی پر شک ہے، کہ وہ ہی ایسا کرتا ہے تاکہ میں جلدی مرجاؤں اور وہ میرے مکان پر بھی قبضہ کر سکے۔ حالانکہ اُس کا اپنا مکان اتنا زیادہ اور بڑا ہے کہ اس کے لئے اُسے سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور یہ شک میرے اندر میری اپنی ہی آنکھوں نے پیدا کیا ہے جنہوں نے اپنے اندر دُنیا کو سمیٹ لیا مگر بیچارے پاؤں اپنا وجود نہ بڑھا سکے اور اسی کشمکش کا نتیجہ یہ ہے کہ جسم اپنے ہی پاؤں پر نہیں ٹھہر سکتا۔ اور آج جسم پاؤں پر بوجھ بن گیا ہے اور پاؤں کی اپنی رفتار بھی ختم ہو گئی ہے وہ ہوا میں اُڑ نہیں سکتے، سمندروں میں تیر نہیں سکتے، جسم اتنا بھاری ہے کہ پاؤں زمین کے گڑھوں میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی خواہش پوری نہ ہوئی تو یہ دُشمنی پر آمادہ ہو گئیں۔

میری اپنے پڑوسی سے پُرکھوں کے وقت سے دُشمنی چلی آرہی ہے اور وہ بھی مجھ سے دُشمنی کرتا ہے۔ ایک بار ایک شخص نے مجھ سے پُوچھا "آپ کی ساتھ والے پڑوسی سے کیا دُشمنی ہے" میں نے جواب دیا "کوئی بھی نہیں، صرف یہ کہ وہ مجھ سے دُشمنی کرتا ہے" ایک بار میرے پڑوسی سے کسی نے مجھ سے دُشمنی کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا کہ "میں اُس سے دُشمنی اس لئے کرتا ہوں کیونکہ وہ مجھ سے دُشمنی کرتا ہے۔"

صدیوں سے یہ دُشمنیوں کا سلسلہ چلا آرہا ہے کیونکہ تمام لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے گھر

کے اندر تیز ہتھیار جمع کر رکھے ہیں۔ ہتھیار ہمیشہ اپنی حفاظت کے لئے رکھے جاتے ہیں مگر یہ قتل دوسروں کا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہتھیاروں کی یہ خاصیت ہے کہ یہ ہتھیار رہنا چاہتے ہیں۔ اور ہتھیار تبھی ہتھیار رہتا ہے جب وہ کسی کا خون بہائے، کسی کو قتل کرے۔ ہاتھ کسی کو کبھی قتل نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی خاصیت مرہم کرنا ہے لیکن ہتھیار انہیں اپنا غلام بنا دیتے ہیں۔ ہتھیار آنکھوں کے اندر خون دیکھنے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔ کانوں کو چیخیں سننے کی عادت ڈالتے ہیں۔ ہتھیار صرف خون بہانا جانتے ہیں، چاہے وہ اپنا خون ہو یا غیر کا۔ ہتھیار کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ وہ کسی رشتے ناطے تہذیب و اخلاق کو نہیں مانتے۔

ایک دن ہوا کے جھونکے نے میری آنکھوں کو آنسوؤں کے شہر میں پھینک دیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میرے سینے کا زخم دن بدن گہرا ہو رہا ہے اور اسے مرہم کی ضرورت ہے۔ یہ زخم میرے سینے کے اندر اُس وقت پیدا ہوا تھا جب ایک روز میں نے اپنے دل کے اندر اپنے دشمن کو مار کر قبر کھودنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے زور سے ہتھیار پھینکے اور اپنے ناخنوں کو بھی کٹوا دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری انگلیوں کو رہائی مل گئی ہے میرے ہاتھ آزاد ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے پڑوسی سے پوچھا کہ تم مجھ سے کیوں دُشمنی کرتے ہو؟ وہ حیران ہو گیا۔ کیوں کہ آج تک یہ سوال اُس سے کسی نے نہ پوچھا تھا۔ اور نہ ہی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہماری آپس میں دُشمنی ہے، بلکہ ہم تو دوستی کا پرچار کرتے تھے مگر ہتھیار بھی جمع کرتے گئے

میرے سوال نے اُس کے اندر جرأت پیدا کی اور اُس نے جواب دیا "مجھے شک ہے کہ تم میری عمر کے دھاگے کو گانٹھ مار کر اس کی لمبائی کو کم کر دیتے ہو۔ اور ایسا تم اس لئے کرتے ہو تاکہ میرے مرنے کے بعد تم میرے مکان پر قبضہ کر سکو۔" میں نے کہا اور میں آج تک تمہارے بارے میں یہی سوچتا رہا۔ اس بات کا چرچہ سارے شہر میں ہوا۔ سب نے ایک دوسرے کو اپنی دشمنی کی وجہ بیان کی۔ تمام شہر کے لوگوں نے اعلان کیا کہ وہ اس بار عمر کے دھاگوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر رکھیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کون گانٹھ لگاتا ہے۔ سب نے اپنی آنکھیں ہاتھوں پر مرکوز کیں مگر دیکھکر حیران ہو گئے کہ اُن کے اپنے ہی ہاتھوں نے عمر کے دھاگوں کو گانٹھیں لگائیں۔

رفتار

"آج پھر کوئی طوفان آنے والا ہے۔" "تمہیں کیسے پتہ لگا" پانی کے بدن والے شخص نے پوچھا۔ "آج پھر لوگ بچوں کو کہانیاں سُنا رہے ہیں" لوگ جب بھی بچوں کو پرانی کہانیاں سُناتے ہیں تو طوفان ضرور آتا ہے۔

ایک بہت پُرانے جوگی کا خیال ہے کہ لوگ صرف جوانی کی کہانیاں سُناتے ہی نہیں بلکہ دُہراتے ہیں اور انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ جوانی کی صرف ایک ہی کہانی ہے کیونکہ تمام لوگوں کو ایک ہی جیسے برس اور مہینے

نصیب ہوتے ہیں اور تمام آنکھوں کے اندر ایک ہی طرح کی خواہشیں ابھرتی ہیں۔ اور لوگ چونکہ جھوٹ بولتے ہیں اور بچے ان کی باتوں پہ یقین کر لیتے ہیں اس لئے دریا میں طوفان آ جاتا ہے۔

مگر ایک دوسرے جوگی کا خیال ہے چونکہ لوگوں کی کہانیاں ان کی وہ خواہشیں ہیں جو پوری نہیں ہوئیں اور لوگ انہیں سنا کر اپنے دل کی پیاس بجھاتے ہیں اور دریا اس کی تصدیق کرتا ہے اور بچوں کو بغاوت کے لئے اکساتا ہے اس لئے اس میں طوفان آتا ہے۔

اور بستی کے بوڑھے محض اس لئے جوگی بن رہے ہیں کہ لوگوں کے لئے کوئی اور وجہ ڈھونڈ سکیں کیونکہ لوگوں کے پاس جب کسی چیز کے لئے کوئی وجہ نہیں رہتی تو پھر یہ بستی کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں اور تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بچے ان بوڑھوں کی عزت کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور بستی بستی نہیں رہتی۔

دریا میں جب بھی طوفان آتا ہے تو ساری بستی کانپ جاتی ہے پرندے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ گھر بہہ جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ اپنے بچوں کو کہانیاں ضرور سناتے ہیں۔

اتنے میں وہ شخص آیا اور کہنے لگا ”میں تمہارے چرائے ہوئے لفظ واپس لے آیا ہوں۔ اس لئے اب میری رفتار مجھے واپس کر دو“۔ حالانکہ وہ شخص اس بات کو جانتا ہے کہ لوگ چیزیں دے تو سکتے ہیں مگر واپس نہیں کر سکتے۔

ورق الٹنے والے کو اپنی انگلیوں سے محروم ہونا پڑا۔ وہ شخص

اُن سطروں کی تلاش میں تھا جن کے ذریعہ کتاب لکھنے کا حکم دیا گیا تھا مگر ہوا یہ کہ اُسے اپنا ہی بوجھ ہونا پڑا۔ گہرائی دیکھنے والے کی آنکھیں دھیمی پڑ رہ گیئں۔ راستے کی لمبائی جاننے والے شخص کا قد چھوٹا ہو گیا۔ مگر سبق آج بھی یہی ہے کہ سچائی کی تلاش ضروری ہے اور ہمارے پیدا ہونے کا مقصد صرف یہ جاننا ہے کہ ہم کیوں پیدا ہوئے تھے۔

بھیڑ اُسے دیکھ کر چونک گئی۔ کیونکہ اب کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ شخص واپس آئے گا۔

وہ سب سے تیز دوڑتا تھا اور کارواں کے آگے نکل جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اُن کو راستے کے خطرات سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکی رفتار نے خوبصورت لڑکیوں کے جسموں کے ابھاروں کو اپنے ساتھ کھینچنا شروع کر دیا اور لڑکیوں نے اُسکی رفتار کو دلکش بنانے کے لئے اپنے پاؤں پر پازیبیں باندھیں۔ اپنی آنکھوں کے اندر آسمان کا نیلا رنگ سمونے کی کوشش کی۔ پازیبوں کی آواز سُن کر درختوں کے پتوں نے ملن کے گیت گانے شروع کر دئے۔ اور ہوائیں بھولے بسرے نغموں کو واپس لے آئیں اور گھاس پر اُگے ہوئے پھولوں نے خوشبو بکھیرنی شروع کر دی اور یہ اعلان ہوا کہ آسمان پر کسی کے پاپ پُن کا کوئی حساب نہیں لیا جائے گا لہٰذا سب ایک دوسرے کے بدن کے ساتھ لپٹ سکتے ہیں۔ لفظوں کو آواز مل گئی اور خاموش ساز خود بخود بجنے لگے۔ سب نے محسوس کیا کہ اب وہ جنم مرن کے چکر سے آزاد ہو جائیں گے مگر اب کی بار بھی وہی ہوا جو اُس وقت ہوا تھا جب آسمان نے بے رنگ

ساڑھیوں کو رنگنے کے لئے رنگ، پھینکے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ بستی کے لوگوں نے سورج کی روشنی کو سات رنگوں میں بانٹ کر اسے وقت کے طبلے پر نچانا چاہا تھا اور یہ خواہش کی تھی کہ آسمان کی اپسرائیں ننگی ہو کر ان کے حضور میں پیش ہوں اور فریاد کریں کہ دیوتا ان پر ظلم کرتے ہیں۔ ان سے بھوگ کرتے ہیں لہٰذا انسان انھیں بچائیں۔ مگر ان کی اس خواہش نے ان کی آنکھوں کے اندر ایسے پردے پیدا کئے کہ انھیں دوسروں کے بدن تو ننگے دکھائی دینے لگے، ان کے اپنے چہرے بے رنگ ہوتے گئے اور ہر بدن کی خوبصورتی کو چراتی رہی مگر انھیں علم نہ ہو سکا۔ اور بعد میں انھیں یہ معلوم تو ہوا کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہے مگر اس وقت تک وہ اپنی آرزوؤں کی بلی چڑھا چکے تھے۔

اور اس بار پھر اس کی رفتار لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی، وہ اس کے پاؤں کے دشمن بن گئے حالانکہ وہ انھیں آنے والے موسموں کے بارے میں بتاتا تھا۔ اصل میں لوگوں کی نفرت کی وجہ وہ پیار ہے جو بستی کی لڑکیوں کے دل میں آ گئے، اس کی رفتار کی وجہ سے پیدا ہوا تھا بستی کی لڑکیاں اکثر باتیں کرتی تھیں "وہاں، بیچارہ تھک جاتا ہوگا۔ ہمارے لئے وہ کتنی مصیبت جھیلتا ہے"۔ بستی کے رشتوں کو یہ باتیں چبھتی تھیں۔ خاوند، بھائی، باپ تین مختلف رشتے ہیں مگر تینوں پر ان کی باتوں کا ایک سا اثر ہوتا تھا۔

لوگوں نے اس سے دشمنی کی وجہ تلاش کرنی شروع کی، اور وہ اتنے مصروف ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوراخوں سے سانپ بھی آنا جانے شروع

ہو گئے مگر اس بات کا انھیں علم نہ ہو سکا۔ آخر کار انھوں نے وجہ ڈھونڈ لی اور یہ اعلان بھی ہو گیا۔ "ہوا کی رفتار ہماری نیندوں کی دشمن ہے اور اسی وجہ سے آسمان نے ہم سے دشمنی کی ہے کیونکہ بارش نے کھیت سوکھا ڈالے ہیں"

حالانکہ لوگوں کی نیند نہ آنے کی وجہ وہ خواہشیں ہیں۔ جو ان کی آنکھوں کو کشادہ رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نیند تو آتی ہے مگر ان کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں اور سانپوں کا ڈر بچوں کو ماں باپ سے الگ نہیں سونے دیتا۔ اور آسمان سے دشمنی کی وجہ ان کی انگلیوں پر بڑھے ہوئے ناخن ہیں جو اس پر خراشیں ڈالنا چاہتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے خود یہ ناخن بڑھائے ہیں۔

مگر اس شخص کی آواز کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تنگ آکر اس نے پھر بستی کے بچوں کو کہانی سنانی شروع کر دی۔ اور پھر وہی ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔ آندھیاں اندھی ہو کر ٹھوکریں کھانے لگیں اور موسموں کی بے رحمی نے دھوپ کی کرنوں کو تیز کر دیا۔ لوگوں کو کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک شخص کے ہاتھوں نے اس کی اپنی ہی گردن دبانی شروع کر دی۔ اعلان ہوا کہ حملہ ہو گیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے پاؤں ایک دوسرے کے پیٹ پر مارنے شروع کر دیئے اور سب کی آنکھیں اس دشمن کی تلاش میں ہیں جس نے ان کے اوپر حملہ کیا ہے۔

اس سڑک پر دن رات آدمی، گھوڑے، بسیں چلتی رہتی ہیں لیکن یہ سڑک کبھی نہیں چلتی یہ آگے بڑھتی ہے۔ زندگی کی سڑک کی طرح جو ختم ہوتی ہے لیکن واپس نہیں آتی اور اس پر چلنے والا وقت ہماری تقسیم اوقات اور طرح طرح کے نام دینے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ سڑک کو معلوم نہیں کہ یہ کہاں سے آئی ہے لیکن لوگ یہ بتاتے ہیں کہ سامنے والے جنگل کو انھوں نے اسی سڑک کے ذریعہ چھوڑا تھا اور بعد میں وہ اسی سڑک کے کنارے بس گئے مکانوں میں، جن کی دیواروں نے انسان کو سڑک سے الگ کر دیا لیکن ان

کی کھڑکیوں ان کے دروازوں نے ایک تعلق بنائے رکھا، کبھی کبھی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اونچی منزلوں والے یہ مکان آسمان کو چھونے لگے ہیں حالانکہ وہ سب یہ جانتے ہیں کہ آسمان نام کی کوئی شئے نہیں ہے ہر ایک آدمی کا اپنا آسمان ہے جس کی نظر جہاں تک پہنچی وہیں تک اس کا آسمان۔ آسمان زمین پر رہنے کا ایک سہارا ہے زندہ رہنے کے لئے ایک وجہ ہے اور مرنے کے لئے ایک حوصلہ ہے آسمان ایک ایسا خیال ہے جو ہر ستارے کو یہ بتاتا ہے کہ وہ اس خلا میں اکیلا نہیں ہے۔

یہ بھی سنا ہے کہ جنگل میں سب کا نام انسان تھا یا یوں کہیں کہ جنگل میں کسی کا کوئی نام نہیں تھا، سانپ، گیدڑ، شیر، چیتا اور انسان۔ لیکن یہاں ہندو ہیں، مسلمان ہیں، سکھ ہیں، عیسائی ہیں، دھرم، مذہب اور ذاتیں ہیں، رشتے ناطے اور تعلقات ہیں، ایک کی بہن دوسرے کی بیوی ہے، ایک کی بیٹی دوسرے کی ساس ہے ایک کا دوست دوسرے کا دشمن ہے۔ گویا ہر کوئی دوسرے کا کچھ ہے، یہ سب ان ناموں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ اب اپنے لئے نہیں بلکہ ان ناموں کے لئے جیتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ نام لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور لفظوں کی حقیقت عارضی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ کاغذ پر ایک دھبہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اپنا مطلب کھو دیتا ہے۔

اسی سڑک کے کنارے سامنے والے مکان میں ایک آدمی رہتا ہے جس کا نام محمد علی ہے وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، کسی کو بھائی بنانا چاہتا ہے

کتنی ظالم ہے یہ سڑک جو آج تک اُسے ایک بھائی نہ دے سکی اور اسی سڑک کے کنارے رام لال اپنے اکلوتے بھائی کو اس لئے مارنا چاہتا ہے کہ وہ کل جائیداد میں اُس سے حصہ مانگے گا۔ ان دونوں باتوں کا ظالم سڑک پر کوئی اثر نہیں۔

اس سڑک کے سامنے پہاڑی پر محمد جُو کا گھر ہے۔ جس کے لڑکے کے پیٹ میں درد ہے اور اس کے پڑوسی دین محمدؐ کے لڑکے کے گُردے میں درد ہے اور سائیں بھکڑا کو دو ہزار روپیہ اس لیے دیا کہ وہ اس کے لڑکے کے پیٹ کے درد کو کسی اور کو دے دے۔ اور دین محمدؐ نے سائیں بھکڑا کو زمین کا ٹکڑا دے کر خوش کیا کہ وہ اس کے لڑکے کے گُردے کے درد کو لوٹانے کے ذریعہ کسی اور کے گُردے میں پہنچا دے۔ ہوا یوں کہ محمد جُو کے لڑکے کا پیٹ کا درد دین محمدؐ کے لڑکے کے پیٹ میں چلا گیا اور اُس کے لڑکے کا گُردے کا درد اس کے لڑکے کو مِل گیا۔ درد بدل گئے، تکلیفیں وہی رہیں۔ دراصل ہم درد بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا درد دوسروں کو دینا چاہتے ہیں۔ اسے ختم نہیں کرنا چاہتے۔

وہ دیکھو ایک آدمی جدھر گاڑی مڑتی ہے اُدھر ہی مڑ جاتا رہا ہے پولیس والا اُسے ایک مہینہ تھپڑ مارتا رہا۔ ایک مہینہ مار کھانے کے بعد اسے معلوم ہوا جب گاڑی آئے کھڑے ہو جاؤ ڈرائیور خود راستہ بنائے گا۔ پولیس والا اگر مارنے کے بجائے اُسے سمجھا دیتا تو وہ ایک مہینہ مار نہ کھاتا اور یہ نہ سوچتا کہ ایسی حالت سے بچنے کا طریقہ کیا ہے بلکہ اس سے آگے سوچتا۔

سامنے والے مکان میں ایک ڈاکٹر کینسر کا علاج ڈھونڈھ رہا تھا کہ آدھا علاج ڈھونڈھنے کے بعد مر گیا۔ اب دوسرے آدمی نے ڈھونڈھنا شروع کیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ آدھا علاج ڈھونڈھنے کے بعد یہ بھی مر جائے گا۔ لیکن پہلا آدمی جہاں تک اس نے ڈھونڈا تھا دوسرے کو بتا دیتا تو کینسر کا علاج مل جاتا کیونکہ دوسرا وہیں سے شروع کرتا۔ لیکن سڑک کے کنارے رہنے والے لوگ دوسروں کو اپنے تجربات کا فائدہ کم ہی اٹھانے دیتے ہیں گو جنگل میں ایسا نہیں تھا۔

میں اس وقت سڑک کے درمیان میں ہوں۔ مجھے چلنا ہے صرف چلنا ہے۔ آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ ہزاروں سال گذر گئے مجھے چلتے ہوئے۔ میں نے کئی دریاؤں کو تیر کر پار کیا، پہاڑوں کو پھاندا۔ تپتے صحراؤں کی گرمی اپنے پر سہی۔ ریت میرے کانوں اور ناک میں چلی گئی۔ مٹی میرے جسم سے لپٹ گئی۔ میں صرف آگے چلتا جا رہا ہوں۔ میں کروڑوں میل چلا۔ لیکن میں گھرا رہا۔ مشرق، مغرب، شمال جنوب میں۔ میں ہمیشہ ان کے بیچ میں رہا۔ آخر میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے میں چلا تھا۔

اب میں مغرب کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ وہی سفر، وہی پہاڑ، وہی سمندر وہی دن رات، سال، صدی، صحرا، کچھ وہی۔ تم بھی وہی۔ خوشی بھی وہی۔ صرف دل کو ایک تسکین ہے کہ میں نے راستہ بدل لیا۔ پھر میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

اب میں شمال کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اب میں جنوب کی طرف بڑھ رہا

ہوں۔ پھر وہی "آگے" "پیچھے" "دائیں" "بائیں" انہی سمتوں میں گھرا رہا۔
میرا وجود آزاد نہ ہو سکا۔ میری رفتار مجھ سے آگے بڑھ گئی۔ میری سوچ مجھ
سے آگے نکل گئی۔ اور میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

میں مشرق ہوں   میں مغرب ہوں

میں شمال ہوں   میں جنوب ہوں

سب لوگ میرے گرد گھومتے ہیں، سب مجھ میں ہیں میں سب میں ہوں، سب
گھومتے ہیں۔ زمین، سورج، چاند، ستارے سب گھومتے ہیں۔ اپنے محور کے
گرد کیونکہ یہ اپنے خدا ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے گرد گھومتے ہیں۔ کائنات کو
مجموعی شکل دینے کے لئے، ستاروں اور خلا کے درمیان تعلق پیدا کرنے
کے لئے۔ زمین کا سورج سے اور چاند کا زمین سے رشتہ صرف گھومنے کا ہے
اور اسی تعلق سے یہ کائنات زندہ ہے۔

اپنی زندگی کے لئے اپنے محور کے گرد گھومنا ضروری ہے اور کائنات
کی زندگی کے لئے ایک دوسرے کے گرد گھومنا ضروری ہے۔ یہی زندگی کا
فلسفہ ہے۔

لیکن یہ سڑک تہذیب کی نشانی ہے۔ چلے چلو اس پر لیکن یہ سب مجھے
بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل یہ سڑک ایک وسیع جنگل کے دو بکھرے
ہوئے ٹکڑوں کو آپس میں ملاتی ہے۔

عدالت

کمرہ۔ جو باقی کمروں کی طرح ہی ہے مگر کرسیوں کی ترتیب، میز اور فائلوں
کی وجہ سے عدالت بن گیا ہے۔ ہر فائل ایک کہانی ہے۔ ادھوری کہانی، جس کا
انجام ابھی لکھا جانا باقی ہے لیکن غلطی تو یہاں پہ ہے کہ جسے ہم انجام سمجھتے
ہیں، وہی ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ لگتا ہے ہم میں سے ہر ایک کی زندگی
مقدمے کی فائل ہے۔ جس میں رشتے بننے اور ٹوٹنے کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر
رشتے کا ایک اچھوتا تعلق دوسرے رشتے سے ہے۔ میری آنکھوں کا تعلق

اس کے چہرے سے اور اس کے بدن کا واسطہ میرے ہاتھوں سے ہے۔ اس کمرے میں لوگ آتے ہیں فیصلے سنتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لوگ نہ تو کچھ ساتھ لے کر آتے ہیں اور نہ کچھ لے کر جاتے ہیں۔ بس فائل پر کچھ لکھا جاتا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ فائل پر لکھا جانے والا ہر لفظ فیصلہ سننے والے کے دل پر لکھا جاتا ہے یہی بات ہے کہ لوگوں کے بدن کو ان کے دل کافی بھاری ہو گئے ہیں اور اسی بوجھ کی وجہ سے ہر شخص کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی ہیں اور وہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ دوسرا اُسے ڈرا رہا ہے اور اسی ڈر کی وجہ سے انہوں نے اپنی جیبوں میں تیز چاقو رکھ لئے ہیں جنہیں وہ ہمیشہ کھلے رکھتے ہیں اور ہر شخص کی موت اس کے اپنے چاقو کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ایک آدمی نے عاجزی سے کہا، "جناب اس مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں کر دیجئے"، کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے چھت کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ فیصلے چھت کرتا ہے اور تم چھت تک نہ پہنچ پاؤ گے ایسا اس لئے ہے کہ تم جب پیدا ہوئے تھے تو تمہارا باپ لوگوں کے پاجامے چرا رہا تھا۔

سامنے بیٹھے ہوئے وکیل گھڑی سے اپنی آنکھوں کو چرا رہے ہیں۔ گھڑی جو بے جان ہے لیکن سب اپنی زندگی اسی کے ذریعے گنتے ہیں یہ لوگ آنکھیں اس لئے چرا رہے ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں ان کے جسموں سے بغاوت کر کے باہر آنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ یہ بے زبان ہیں اور چیخ نہیں سکتی اور ایسا اس لئے ہے کیونکہ ان کی آنکھوں اور دل کے درمیان ایک عجیب سی کشمکش

ہے اور ان کی آنکھوں نے بادھا گھڑی سے یہ فریاد بھی کی کہ ایسا کیوں ہے کہ انہیں تو کچھ نظر آئے اور وہ یہ ظاہر کریں کہ انہیں دکھائی کچھ اور دیتا ہے مگر گھڑی پر اس کا کوئی اثر نہیں ۔

دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئیاں تو صرف ایک اور بارہ کے گرد گھومتی ہیں تو پھر صدیوں کا جنم کہاں سے ہوتا ہے اور دن اور مہینے کس کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ سوال پوچھنے والوں کے بچوں کو قتل کر کے یہ کہا گیا کہ وہ یہ تمہاری مرضی کے بغیر پیدا ہوئے تھے اس لئے تمہاری مرضی کے خلاف ختم کر دیئے گئے ۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز یوں محسوس ہو رہی ہے جیسے صدیوں کو پیچھے دھکیلا جا رہا ہے اور یہ لفظ چیخ رہے ہیں ۔ رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور آسمان پر دراڑیں پڑ رہی ہیں ۔ مگر گھڑی کی سوئیوں کی گنتی تو صرف ایک سے بارہ تک ہی رہتی ہے !

باہر بارش تیز ہو رہی ہے مگر گھڑی سے وہی آہستہ آہستہ ٹک ٹک کی آواز آرہی ہے ۔ گویا گھڑی کہہ رہی ہو مجھ پر تیز بارش کا کوئی اثر نہیں ۔ طوفان کتنے ہی تیز کیوں نہ ہوں مگر گھڑی کی رفتار پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ گھڑی کی ان دو سوئیوں کے درمیان نہ جانے بچپن لڑکپن و جوانی کے کتنے کھیل چھپے رہتے ہیں ۔ گھڑی کی دو سوئیاں لامحدود سلسلوں کو پیدا کرتی ہیں ۔ ست یگ ۔ دواپر ۔ ترتیا ۔ کل یگ سب ان دو سوئیوں میں گرفتار ہیں ۔ نہ گھڑی کی گنتی بڑھتی ہے اور نہ ہی ان دو سوئیوں کی لمبائی ۔ بڑی سوئی زیادہ گھومتی ہے ۔ اُسے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ چھوٹی

سوئی ٹوٹ نہ جائے۔ کیوں کہ بڑی سوئی نے کتنا سفر طے کیا یہ چھوٹی سوئی ظاہر کرتی ہے۔

بارش اور تیز ہونے لگی۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص سے پھر ایک آدمی نے کہا "مجھ پر رحم کرو" لیکن اس کے بدلے میں اُس نے گلدان اٹھا کر زور سے دیوار پر مارا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے بارش کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔

بارش اور تیز ہو گئی۔ باہر طوفان آگیا۔ کھڑکیاں اور دروازے بجنے لگے۔ گویا کہہ رہے ہوں ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں، ہمیں آزاد کر دو۔ لگتا ہے ہر چیز کی بناوٹ ہی اس کی قید کی وجہ ہے۔ اُف اتنا بڑا طوفان تو آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ "ہم میں سے آج کوئی نہیں بچے گا" "میرے بیوی بچے" تو اس وقت تک مر چکے ہوں گے لیکن گھڑی کی اب بھی وہی رفتار ہے جو پہلے تھی۔ بارش اور طوفان کے اثر سے گھڑی کمت ہے۔

وہ شخص کرسی سے اٹھا۔ وکیل بھی اُٹھے اور لوگ جو برآمدے میں کھڑے تھے، کمرے کے اندر آگئے۔ چپراسی نے انہیں اس بار روکا نہیں۔ سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ نہ کوئی وکیل ہے نہ جج ہے نہ مجرم۔ نہ کسی کی کوئی بیوی ہے نہ بیٹا ہے نہ بھائی ہے۔ بس ایک کمرہ ہے اور وہ سب ہیں۔ اُن کا آپس میں ایک ہی رشتہ ہے کہ وہ انسان ہیں اور کمرے کی وجہ سے اُن کا آپس میں تعلق بنا ہوا ہے، نہ کوئی وکیل نہ جج، بس کمرہ ہے اور وہ ہیں۔ اب بھی کرسیوں کی ترتیب میز اور فائلوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ عدالت

ہے۔ مگر لوگوں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کے طریقے سے لگ رہا ہے کہ
یہ صرف ایک کمرہ ہے۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز اب یہ کہہ رہی ہے کہ اسی
بات کی لڑائی ہے کمرہ صرف کمرہ رہنا چاہتا ہے جبکہ کرسیاں اور میز اسے
عدالت میں بدلنا چاہتے ہیں۔ اب انھوں نے کمرے کی وجہ سے ایک دوسرے
سے رشتے پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ "تمہارے ہاتھوں کی انگلیاں
میرے پاؤں کی انگلیوں جیسی ہیں"۔ "میری ہتھیلی پر جو تل ہے اس کی بناوٹ
تمہاری آنکھوں جیسی ہے۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے گلدان کے ٹوٹے
ہوئے ٹکڑے اکھٹے کرنا شروع کر دیئے۔ ٹکڑے محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے
درمیان ایک نامعلوم وقت سے ایک انجانا رشتہ قائم ہے مگر وہ چھپا ہوا
تھا۔ اب بارش کا پانی اسے ظاہر کر رہا ہے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد طوفان ختم گیا۔ سب کو محسوس ہوا کہ اُن کے
بیچ "ہیں، رشتے ناطے ہیں۔ مگر کمرے میں موجود لوگوں کا آپس میں کوئی رشتہ
نہیں۔ تمام لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر جا رہے ہیں مگر سب ایک دوسرے سے
شرمندہ ہیں۔ انہیں لگ رہا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے کا کچھ چرایا ہے
بچہ اسی لوگوں کو باہر نہیں نکال رہا۔ بلکہ لوگ خود بخود باہر جا رہے ہیں۔

گذشتہ دہائی میں جن چند ناموں نے اپنے افسانوں سے اردو
دنیا کو متوجہ کیا ہے ان میں ایک نمایاں نام آنند لہر کا ہے۔ موجودہ
سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں کو انھوں نے اپنے افسانوں
کا موضوع بنایا ہے۔ جن لوگوں کو نئے اردو افسانہ میں
'کہانی پن' کی تلاش ہے انہیں آنند لہر کے افسانوں
کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ جن میں عصری صداقتوں کو تخلیقی فن
کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کمار پاشی